کامیاب لوگوں کی دلچسپ باتیں

ڈیل کارنیگی

تعارف

ڈیل کارنیگی 24 نومبر 1988ء کو امریکہ میں میری ول منروری کے مقام پر پیدا ہوا۔ کون کہتا ہے کہ وہ 1955ء کو انتقال کر گیا۔ یہ درست ہے کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ مگر وہ لاکھوں کروڑوں نہیں بلکہ اربوں قارئین کے دلوں میں اپنی بے مثال تحریروں کی صورت میں زندہ ہے۔ اس کی ابدی زندگی اور شہرت دوام کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ ڈیل کارنیگی نے جن اداروں سے فیض اکتساب کیا، ان اداروں کی عزت وتوقیر میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ تشنگان علم اس مادر علمی کے درودیوار کو دیکھنا بھی قابل فخر گردانتے ہیں۔ ڈیل کارنیگی نے سٹیٹ ٹیچرز کالج وارنز برگ میں 1904 سے لے کر 1908ء تک امریکن اکادمی ڈرامٹیک نیویارک میں 1911ء میں اور کولمبیا یونیورسٹی سکول آف جرنلزم سے 1914ء میں تعلیم حاصل کی۔ اس نے لازوال شہرت کی حامل کتابیں تصنیف کیں۔ ایسی کتابیں تصنیف کرنے کا خواب تو ہر لکھاری دیکھتا ہے۔ مگر ایسی تعبیر ڈیل کارنیگی جیسے افراد ہی کو ملتی ہے۔ کارنیگی نے صرف اپنی کتابیں ہی نہیں لکھیں۔ بلکہ قائل ومتاثر کرنے کے طریقوں پر نیز گفتگو اور تقریر کے فن سے روشناس کرانے کے ادارے بھی چلائے۔ جہاں پر ایسے علوم اور فنون پر عملی

تعلیم دی جاتی تھی ۔ کارنیگی امریکہ کے ستر اخباروں میں مخصوص موضوعات پر کالم بھی لکھتا تھا۔ اس کی تمام کتب کے انگریزی سے اقوام عالم کی تقریباً تمام زبانوں میں تراجم شائع ہو چکے ہیں۔

یہ بات بغیر کسی شک وشبے کے کہی جا سکتی ہے بلکہ اس کی تصدیق تو چہار دانگ عالم سے ہو چکی ہے کہ جس سے کسی کو ذرا بھر بھی تشکیک نہیں ہے۔ کہ کارنیگی فن تقریر اور شخصیت سازی کا بانی تھا۔ وہ ابتداء ہی سے اب تک شہرت کے سب سے اونچے مینار پر کھڑا تھا۔ اور اس مینار کی بنیاد اس بات پر استوار ہوئی کہ انتہائی مشکل اور کٹھن دور میں بھی کامیابی وکامرانی سے ہم کنار ہوا جا سکتا ہے۔ اس کی کتابوں کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ جب اس کی کتاب

h ow to win friends and anfluence

people ڈیل کارنیگی کی یہ کتاب 1936ء میں شائع ہوئی تو اس کی ایک کروڑ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ بین الاقوامی زبانوں کے تراجم کی اشاعت کے اعداد وشمار اس میں شامل نہیں۔

اس کی کتابوں کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنی کتابوں میں کامیابی وکامرانی کے راز تجربات کے ذریعے افشاں کرتا تھا۔ نیز وہ ان کتابوں میں خاکے اور اشکال وامثال کی مدد سے قارئین کو الجھنوں اور دیگر جھنجٹوں سے نجات دلاتا۔ اس کا انداز نگارش سادہ،

سہل، دل نشین اور عام روز کے مطابق ہوتا۔اس کی تحریر جادو سے مرصع ہوتی۔وہ جادو یہ تھا کہ اس کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ انسانیت کی فلاح و بہبود کی جائے، اور مسائل کے گرداب و بھنور میں ڈولتی ناؤ کو منجدھار سے نکال کر کامیابیوں کے ساحل تک پہنچایا جائے۔اس کی باتوں تحریروں، انداز گفتار اور کتب میں اتنی اثر پذیری کا راز یہ تھا کہ وہ دل سے بات کرتا تھا۔اور وہ دل پر اثر کرتی تھی۔اس اثر انگیزی سے سحر کے چشمے پھوٹتے تھے۔جو علم و عمل کے پیاسوں کی تشنگی بجھاتے تھے۔

کارنیگی کی تقریروں تحریروں کا مرکز محور یہ رہا کہ وہ کہتا ہے کہ یقین اور اعتماد کی ڈور کو اپنے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ دو۔پھر آپ کی خواہشات کی پتنگ نیل گوں آسمان کی بلندیوں کو چھو کر رہے گی۔وہ انسانوں سے محبت کرنے کا درس دیتا تھا۔اور وہ اپنے قاری کو اپنے گر اور فن سے آگاہ کرتا تھا۔جس سے وہ لوگ جو دوسروں کے سامنے ہیچ نظر آتے تھے۔اور ان کے گرد حقارت کا ہالہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جاتا تھا۔وہ انہیں دوسروں کے دلوں میں اپنا مسکن بنانے اور انہیں وہاں پر ہمیشہ کے لیے مکین ہو جانے کی تراکیب سکھاتا ہے۔وہ اپنے قرب وجوار اور معاشرے و ملک کے اندر اپنی عزت و احترام اور کھوئے ہوئے وقار اور پائمال شدہ ساکھ کے ملبے سے تعمیر نو کی

بنیاد رکھنے کے لئے خود معمار کی طرح مختلف زاویے، طریقے اور ہنر سکھاتا ہے۔ اور جب تک قاری ان انہدام شدہ کھنڈروں سے نئی عمارت تعمیر نہیں کر لیتا، وہ خود بھی ہمت نہیں ہارتا، اور نہ ہی قاری کو عزم و استقلال کے ہتھیار رکھنے دیتا ہے۔

ڈیل کارنیگی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک آہنی خود فروخت کرنے والی کمپنی سے کیا اور اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنی کتاب "ublic speeking and influence Men in Business" جو کہ 1931ء میں شائع ہوئی، اس کے بعد اس نے بطور استاد وارنز برگ میں سٹیٹ ٹیچرز کالج میں تدریسی فرائض سرانجام دیے۔

کارنیگی کی کتابیں دنیا کے بیشتر ممالک کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل ہیں۔ اس کی کتابیں ان ممالک کے نصاب میں عملی تدریس کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔ جہاں پر اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ مرد و زن کس طرح اور کن اصولوں اور قاعدوں پر عمل کر کے کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔ نیز دوسروں سے کس طرح قابل قدر اور قابل احترام رشتوں کو استوار رکھا جا سکتا ہے۔

کارنیگی کتنا بڑا ماہر نفسیات ہے، کہ اس نے ایسے موضوعات کو انتخاب کیا کہ اس کے موضوعات سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس نے

مایوسیوں اور محرومیوں کی دلدل میں دھنسے ہوئے لوگوں کو کامیاب زندگی کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ وہ ایک ماہر نباض کی طرح اپنے امراض کا کامیابی سے علاج کرتا ہے۔ جس میں نہ ہینگ لگتی ہے اور نہ پھٹکری۔ بس صرف اس کی کتابوں کا مطالعہ کرنا شرط ہے۔ کارنیگی ناکامی، نامرادی اور مایوسی جیسی تاریکیوں کے بطن سے مسرتوں کی سحر تک پہنچاتا ہے۔ وہ ہمت اور حوصلے پر اسی قدر یقین رکھتا ہے کہ بڑی سے بڑی جنگ جیتنے کے لیے وہ پسپائی جیسے لفظ سے ناآشنا ہے۔

ہم زندگی کی جنگ میں ہارے ضرور ہیں
لیکن کسی محاذ پہ پسپا نہیں ہوئے

اسلم کھوکھر
لیکچرار شعبہ اردو
پی۔اے۔ایف شاہین کالج لوئر ٹوپہ (مری)


ادب

سمرسٹ ماہم

اپنے جس ڈرامے کو وہ بے کار تصور کرتا تھا۔ ''ہیملٹ'' کے بعد اب وہ دوسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔

ذرا بتایئے اسٹیج کا عظیم ڈرامہ کون سا ہے۔ایک بار جب نیو یارک کے مشہور نقادوں نے دنیا کے دس مشہور ڈراموں کے متعلق خفیہ رائے شماری کی تو انھوں نے متفقہ طور پر ''ہیملٹ'' کے حق میں فیصلہ دے دیا۔یہ ڈرامہ آج سے تین سو سال پہلے لکھا گیا تھا۔انھوں نے یہ فیصلہ بھی دیا کہ دنیا کا دوسرا سب سے عظیم ڈرامہ ''میکبتھ'' ''کنگ لیر'' یا ''مرچنٹ آف وینس'' نہیں بلکہ رین (بارش) ہے۔جی ہاں ''رین'' جنوبی سمندروں میں جنس اور مذہب کی باہمی کشمکش کی داستان ۔۔ دنیا کا مشہور ڈرامہ جو سمرسٹ ماہم کی ایک کہانی سے ترتیب دیا گیا ہے۔

ماہم نے ''رین'' سے چالیس ہزار پونڈ کمائے۔حالانکہ اس نے اس کے لکھنے میں پانچ منٹ بھی صرف نہیں کیے تھے۔

دراصل ہوا یوں کہ اس نے ایک کہانی لکھی جس کا نام ''سئیڈی تھامسن'' تھا۔اس کے نزدیک یہ کوئی اتنی اچھی کہانی نہ تھی۔لیکن ایک رات جان کولٹن اس کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔اور وہ سونے سے پہلے یونہی وقت گزارنے کے لیے کچھ پڑھنا چاہتا تھا۔ماہم نے اسے ''سئیڈی تھامسن'' کا مسودہ پڑھنے کے لیے دے دیا۔

کولٹن یہ کہانی پڑھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ چارپائی سے اٹھ کر بند کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسی رات اس نے اپنے تصورات میں اس کہانی کو ڈرامے کی صورت میں دیکھا۔ ایک ایسا ڈرامہ جو لافانی بننے والا تھا۔

دوسری صبح وہ بھاگا بھاگا سمرسٹ ماہم کے پاس گیا۔ اس نے سمرسٹ ماہم کو بتایا کہ اس کہانی میں ایک بہت بڑا ڈرامہ موجود ہے۔ میں رات بھر اس کے متعلق سوچتا رہا۔ قسم لے لو۔ رات بھر نہیں سویا۔

لیکن سمرسٹ ماہم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ڈرامہ؟۔ اس نے اپنے مخصوص برطانوی لہجے میں تعجب سے پوچھا۔ ''ہاں ہوسکتا ہے۔'' اس سے عام قسم کا ڈرامہ بن جائے۔ شاید چار ہفتے چل بھی جائے۔ لیکن ہمیں اس کے لیے کوئی تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ چھوڑو یہ قصہ'' اور وہ ڈرامہ۔ جس کے متعلق وہ کوئی تردد نہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے چالیس ہزار پونڈ دلانے کا ذریعہ بنا۔

جب ڈرامہ لکھ لیا گیا۔ تو اکثر پروڈیوسروں نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ انہیں یقین تھا کہ یہ ناکام ہو جائے گا۔ پھر سیم ہیرس نے ڈرامہ لے لیا۔ وہ اس میں ایک نوجوان ایکٹرس جینی سے کام کرانا چاہتا تھا۔ لیکن پیسے لگانے والے ایجنٹ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی مشہور ایکٹرس کو لیا جائے۔

آخر تگ و دو کے بعد جینی ایگلز کو کام مل گیا۔ اس نے سٹیڈی تھامسن کا کردار اتنی خوبی سے ادا کیا۔ کہ براڈوے والے حیران رہ گئے۔ اس نے مسلسل چار سو پندرہ بار یہی کردار ادا کیا۔ اور ہر بار ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔

سمرسٹ ماہم نے کئی مشہور کتابیں لکھیں جیسے ''آف ہیومن بانڈج'' دی مون اینڈ سکس پینس اور ''دی پینٹڈ ویل'' وہ کئی اور مشہور ڈراموں کا بھی مصنف تھا۔ لیکن اس نے اپنا سب سے مشہور ڈرامہ خود نہیں لکھا۔

لوگ اب بھی اس کی ذہانت کا دم بھرتے ہیں۔ لیکن جب اس نے لکھنا شروع کیا تو گیارہ سال تک مالی پریشانیوں کا سامنا کرتا رہا۔ ذرا اندازہ کریں یہ شخص جس نے بعد میں ایک مصنف کی حیثیت سے 200000 پاونڈ کمائے۔ پہلے گیارہ برس میں کہانیوں اور ناولوں کے ذریعے صرف سو پونڈ سالانہ کماتا تھا۔ بعض اوقات اسے بھوکا بھی رہنا پڑتا۔ اس نے کوشش کی کہ اسے اخبار میں نوکری مل جائے، لیکن ناکام رہا۔ سمرسٹ ماہم نے مجھے بتایا کہ میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں لکھتا رہوں۔ کیونکہ میں ملازمت نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے دوست کہا کرتے تھے کہ وہ حماقت کر رہا ہے۔ وہ میڈیکل کالج کا گریجویٹ تھا۔ اس لئے اس کے دوست زور دیتے کہ وہ افسانہ نویسی چھوڑ کر ڈاکٹری کی دکان کھول لے۔

لیکن وہ تہیہ کر چکا تھا کہ انگریزی ادب کی تاریخ میں اپنا نام ضرور چھوڑ جائے گا۔ اور دنیا کا کوئی شخص اسے اس ارادے سے باز نہ رکھ سکتا تھا۔

''بیلیو اٹ ارناٹ'' (یقین کریں یا نہ کریں) کے مشہور اداکار باب اپیلی نے ایک بار مجھے کہا تھا'' کوئی شخص دس سال محنت کرے اور کوئی اس کا پرسان حال نہ ہو۔ پھر یکا یک وہ پانچ منٹ میں مشہور ہو جائے۔۔۔۔ باب اپیلی اور سمرسٹ ماہم

دونوں کے ساتھ یہی ہوا تھا۔

آیئے میں اب آپ کو سمرسٹ ماہم کی پہلی کامیابی کی کہانی سناؤں۔

لندن میں کسی شخص کا لکھا ہوا ڈرامہ بری طرح ناکام ہوا اور تھیٹر کا مینجر کسی اور ڈرامے کی تلاش میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی اعلیٰ درجے کا ڈرامہ مل جائے۔ اس کی کوشش تو یہ تھی کہ کوئی درمیانے درجے کا ڈرامہ ہی ہاتھ آجائے۔ تاکہ کوئی بہترین سا کھیل ملنے تک تھیٹر تو چلتا رہے۔ چنانچہ اس نے میز کی درازوں میں ہاتھ مارا اور سمرسٹ ماہم کا لکھا ہوا ایک ڈرامہ باہر نکالا۔ اس کا نام ''لیڈی فریڈرک تھا۔'' یہ ڈرامہ کوئی ایک سال سے اس کے میز کی دراز میں پڑا ہوا تھا۔ وہ اسے پڑھ چکا تھا۔ اور جانتا تھا کہ یہ کوئی ایسا اچھا ڈرامہ نہیں ہے۔ تاہم اسے امید تھی کہ شاید یہ دو چار ہفتے چل جائے۔ اس نے یہ ڈرامہ اسٹیج کیا اور اس طرح ایک معجزہ رونما ہو گیا۔ ''لیڈی فریڈرک بے حد کامیاب ہوا۔'' آسکر وائلڈ کے لکھے ہوئے مکالموں کے بعد کسی نے اب تک لندن والوں کو اس قدر محظوظ نہیں کیا تھا۔

اس کے فوراً بعد لندن کے ہر تھیٹر کا مینجر سمرسٹ ماہم کے گھر کے چکر کاٹنے لگا۔ اس نے اپنی الماری سے اپنے پرانے ڈرامے نکالے اور انہیں تھما دیئے۔ چند ہفتوں بعد تین مشہور تھیٹروں میں بیک وقت اس کے ڈرامے انتہائی کامیابی کے ساتھ چل رہے تھے۔

رائلٹی کی صورت میں سمرسٹ ماہم کے گھر دولت کا انبار لگ گیا۔ ناشرین ہر وقت اس سے نئی تصنیف کا تقاضہ کرنے لگے۔ ہر تقریب میں اسے خاص مہمان کی

حیثیت سے بلایا جانے لگا۔ اور گیارہ برس کی گم نامی کے بعد سمرسٹ ماہم نے دیکھا کہ لندن کی بڑی بڑی تقریبوں میں اس کی صحت کے جام نوش کیے جاتے ہیں۔

سمرسٹ ماہم نے مجھے بتایا کہ وہ دوپہر ایک بجے کے بعد کبھی کچھ نہیں لکھتا۔ وہ کہنے لگا، دوپہر کو میرا ذہن بالکل تھک جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ پائپ پیتا ہے۔ اور کوئی چیز لکھنے سے ایک گھنٹہ پہلے فلسفے کی کتابوں کا ضرور مطالعہ کرتا ہے۔ 1940 میں جب فرانس پر یلغار ہوئی تو بھاگ کر انگلستان آ گیا۔ لیکن جنگ کے بعد واپس فرانس چلا گیا۔ اور اب بھی وہیں رہتا ہے۔ (اب تو اس کی موت واقع ہو چکی ہے۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ ضعیف الاعتقاد نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی ہر کتاب کی جلد پر ''منحوس آنکھ'' کا نشان چھپوا رکھا ہے۔ اس کے گھر کی پلیٹوں اور تاش کے پتوں پر بھی یہی نشان موجود ہے۔ اس نے اپنے کمرے کی انگیٹھی کے اوپر دیوار پر بھی یہی نشان کندہ کر رکھا ہے۔ اور صدر دروازے کی پیشانی پر بھی یہی نشان موجود ہے۔ لیکن جب میں نے پوچھا کہ وہ سچ مچ اس نشان پر یقین رکھتا ہے تو وہ فقط مسکرا پڑا۔



لیوٹالسٹائی

وہ دنیا کے دو عظیم ترین ناول لکھنے پر شرم سار تھا۔

لیوٹالسٹائی کی سرگزشت الف لیلہ کی کہانیوں کی طرح حیرت انگیز ہے۔گویا یہ کہ ایسے ولی کی داستان حیات ہے۔جس کا انتقال ہمارے ہی زمانے میں ہوا۔۔یعنی 1910ء میں۔۔۔یہ عظیم شخص اس قدر ہر دل عزیز تھا کہ اس کی وفات سے بیس برس پہلے اس کے دروازے پر عقیدت مندوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ہزاروں لوگ دور دراز سے یہ خواہش دل میں لئے وہاں آتے تھے کہ اس کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ اس کی باتیں سن سکیں یا اس کے ہاتھ کو بوسہ دے سکیں۔

اس کے دوست مسلسل کئی کئی برس تک اس کے گھر ڈیرہ ڈالے رہتے۔اس کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ شارٹ ہینڈ میں قلم بند کرلیتے۔یہاں تک کہ وہ عام زندگی کا کوئی معمولی سے معمولی واقعہ بھی سناتا تو وہ صفحہ قرطاس پر رقم ہو جاتا تھا۔بعد میں ان تمام واقعات کو موٹی موٹی جلدوں کی شکل میں شائع کیا گیا۔

اس شخص کی زندگی اور نظریات کے بارے میں کم وبیش 23000 کتابیں۔۔۔ ذرا اندازہ لگایئے 23000 ہیں،23700 کتابیں اور 56000 مضامین لکھے جا چکے ہیں۔اس کی اپنی نگارشات کی ایک سو دس جلدیں ہیں۔ایک شخص کے لیے اتنا زیادہ لکھنا بہت بڑے معجزے کی سی بات ہے۔اس کی داستان حیات بھی اس کے

لکھے ہوئے بعض ناولوں کی طرح دل چسپ اور رنگین ہے۔وہ بیالیس کمروں کی ایک شان دار حویلی میں پیدا ہوا۔اس کے آس پاس دولت کے انبار لگے ہوئے تھے۔اس نے قدیم روسی رئیسوں کی طرح شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے پرورش پائی۔لیکن اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ اپنی تمام زمین سے دست بردار ہو گیا۔اس نے تمام دنیوی سازوسامان بانٹ دیا۔اور روس کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر وفات پائی۔ مالی اعتبار سے یہ ایک غریب شخص کی موت تھی۔جسے چاروں طرف سے غریب کسانوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

نوجوانی میں وہ بہت خوش لباس تھا۔وہ بڑی نزاکت سے زمین پر نچے تلے قدم رکھتا تھا۔اور ماسکو کے اچھے اچھے درزیوں کی دکانوں کا طواف کرتا رہتا تھا۔لیکن زندگی کے آخری حصے میں وہ روسی کسانوں کی طرح انتہائی سستا لباس پہنتا تھا۔ اپنے جوتے خود اپنے ہاتھوں سے بناتا۔اپنا بستر خود لگاتا۔کمرہ خود صاف کرتا۔اور لکڑی کی ایک بوسیدہ سی میز پر بیٹھ کر لکڑی کے چمچے سے انتہائی سادہ اور سستی غذا کھاتا۔

نوجوانی میں خود اس کے الفاظ میں ''وہ ایک گندی اور ناپاک زندگی بسر کرتا تھا۔ ''وہ شراب پیتا۔۔لوگوں سے لڑائیاں مول لیتا اور ہر اس جرم کا ارتکاب کرتا جس کا ذہن تصور کر سکتا ہے۔حتیٰ کہ قتل جیسے بھیانک جرم سے بھی باز نہ آتا تھا۔لیکن آخری ایام میں وہ معنوی اعتبار سے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات پر پوری طرح کاربند تھا۔اور وہ اپنے تمام علاقے میں انتہائی تقدس کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔

ازدواجی زندگی کے ابتدائی دور میں وہ اور اس کی بیوی اس قدر خوش تھے کہ وہ دو زانو ہو کر خداوند ایزدی سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ وہ ان کی محبت اور مسرت آمیز زندگی کو ہمیشہ قائم رکھے۔لیکن بعد میں یہی ازدواجی زندگی انتہائی ناخوشگوار ہو گئی۔اسے اپنی بیوی کی شکل تک دیکھنا گوارا نہ تھی۔حتیٰ کہ بستر مرگ پر اس کی آخری التجا یہی تھی کہ اس کی بیوی کو اس کے پاس نہ آنے دیا جائے۔نوجوانی کے زمانے میں وہ کالج میں فیل ہوا۔اس کے استادوں نے اس نکمے شاگرد کے ساتھ بہت مغز ماری کی۔لیکن تیس سال بعد اس نے دنیا کے دو عظیم ترین ناول لکھے۔دو ایسے ناول جن کی عظمت صدیوں تک قائم رہے گی۔۔۔۔''وار اینڈ پیس''(جنگ اور امن) اور ''اینا کرنینا''(خودکشی)

روس سے باہر ٹالسٹائی ان تمام زاروں کے مقابلے میں زیادہ مشہور رہے۔جو اس تاریک اور خونین سلطنت پر حکمرانی کرتے رہے ہیں۔اس کے باوجود مشہور ناول لکھنے سے اسے خوشی ہوئی تھی؟۔کچھ دیر کے لیے ضرور ہوئی تھی۔لیکن بعد میں وہ بہت شرمسار ہوا۔اور اس نے اپنی باقی ماندہ زندگی چھوٹے چھوٹے کتابچے لکھنے، امن اور محبت کی تبلیغ اور مفلسی کے خلاف جہاد میں گزار دی۔یہ کتابیں انتہائی کم قیمت پر چھاپی جاتی تھیں۔اور گھوڑا گاڑیوں میں لاد کر گلیوں اور بازاروں میں بیچی جاتی تھیں۔چار سال کی مختصر مدت میں ان کتابچوں کی تعداد 1,2000000 ایک کروڑ بیس لاکھ فروخت ہوئی تھیں۔

آج سے چند برس پہلے مجھے پیرس میں ٹالسٹائی کی سب سے چھوٹی صاحبزادی

سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ اس کی زندگی کے آخری ایام میں اس کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرتی رہی تھی۔ اور موت کے وقت بھی اس کے پاس موجود تھی۔ اور اب وہ زرعی فارم پر کام کرتے ہوئے زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ اور ٹالسٹائی کے بارے میں ان میں سے اکثر حقائق میں نے خود اس کی زبانی سنے ہیں۔ اس نے اپنے باپ کے متعلق ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کا نام ہے۔ "ٹالسٹائی کی داستان الم۔"

یہ حقیقت ہے کہ ٹالسٹائی کی زندگی ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ اور اس المیے میں سب سے بڑی وجہ اس کی ازدواجی زندگی تھی۔ اس کی بیوی عیش و آرام کی دلدادہ تھی۔ اور ٹالسٹائی کو ان چیزوں سے سخت نفرت ہو گئی تھی۔ وہ شہرت اور وقار کی بھوکی تھی۔ اور ٹالسٹائی کی زندگی میں ان چیزوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اسے دولت سے محبت تھی۔ اور ٹالسٹائی کا نظریہ تھا کہ دولت اکٹھی کرنا اور ذاتی جائیداد رکھنا بہت بڑا گناہ ہے۔ وہ اس خیال کی حامی تھی کہ اقتدار جبر کا دوسرا نام ہے۔ اور ٹالسٹائی کا نظریہ تھا کہ صرف محبت سے ہی لوگوں کے دل جیتے جا سکتے ہیں۔

جب وہ حسد کی آگ میں جلنے لگی تو دونوں کے تعلقات اور زیادہ کشیدہ ہو گئے۔ اسے ٹالسٹائی کے دوستوں سے سخت نفرت تھی۔ اس نے اپنی سگی بیٹی تک کو گھر سے نکال دیا۔ اور پھر انتہائی غصے کی حالت میں ٹالسٹائی کے کمرے میں جا کر اس کی لڑکی کی تصویر کو گولی کے نشانے سے فرش پر گرا دیا۔

کئی برس تک وہ اسے گالیوں، بد دعاؤں اور طعنوں کا شکار بناتی رہی۔ اور

خود ٹالسٹائی کے الفاظ میں اس نے گھر کو جہنم کا نمونہ بنا دیا۔۔۔۔ اس سارے فساد کی جڑ یہ تھی کہ ٹالسٹائی اس بات پر مصر تھا کہ وہ کوئی معاوضہ لیے بغیر روسی عوام کے لئے کتابیں لکھتا رہے گا۔

جب وہ اس کی کسی بات کی مخالفت کرتا تو وہ غصے سے پاگل ہو جاتی تھی۔ افیون کی بوتل منہ سے لگا کر فرش پر لوٹنے لگتی، اور بار بار یہ دھمکیاں دیتی کہ وہ کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دے دے گی۔

ان دونوں کی شادی کو تقریباً پچاس برس گزر چکے ہیں بعض اوقات وہ ٹالسٹائی کے سامنے دو زانو ہو کر التجا کرتی کہ اس نے اڑتالیس برس پہلے اپنی ڈائری میں اس کے متعلق جو رومانی تاثرات قلم بند کیے تھے، وہ اسے پڑھ کر سنائے۔ جب وہ مسرتوں کے اس دور کے واقعات اپنی ڈائری سے پڑھ کر سناتا تو وہ دونوں زار و قطار رونے لگتے۔

آخر کار جب وہ بیاسی برس کا ہوا تو اس میں اتنی ہمت نہ رہی کہ اپنے ناخوشگوار ماحول کا مزید مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ 21، اکتوبر 1910ء میں ایک تاریک اور خنک رات کو گھر سے نکل گیا۔ یہ جانے بغیر کہ اس کی منزل کون سی ہے۔

گیارہ روز بعد وہ نمونیے کا شکار ہو کر یہ کہتا ہوا ایک ریلوے اسٹیشن پر انتقال کر گیا کہ ''اللہ تعالٰی مسبب الاسباب ہے۔'' اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ ''جستجو،،،، مسلسل جستجو۔''

☆☆☆

جیک لندن

ایک عرصہ وہ در بدر روٹی مانگا کرتا تھا۔ مگر ایک زمانے میں لوگ اس کے آٹوگراف کے لیے ترسا کرتے تھے۔

چالیس برس سے بھی پہلے کا ذکر ہے۔ ایک خستہ حال اور آوارہ نوجوان ایک مال گاڑی سے نکل کر بفلو شہر میں داخل ہوا۔ اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے گھر گھر روٹی مانگنے لگا۔ ایک سپاہی نے آوارہ گردی کے الزام میں اسے پکڑ لیا۔ اور جب اسے مجسٹریٹ کے سامنے لایا گیا تو مجسٹریٹ نے اسے ایک ماہ قید با مشقت کی سزا دے دی۔ تیس روز تک وہ پتھر توڑتا رہا اور جیل کی سوکھی روٹیاں کھاتا رہا۔

۔

لیکن چھ برس بعد۔۔۔ فقط چھ برس بعد وہی خستہ حال، آوارہ اور بھک منگا نوجوان مغربی امریکہ کا اہم ترین شخص بن گیا۔ کیلی فورنیا کے معزز گھرانے اسے اپنے یہاں مدعو کرتے۔۔ ادیب نقاد، ایڈیٹر اسے ادبی افق کا ایک روشن ستارہ سمجھتے تھے۔۔

انیس برس کی عمر سے پہلے وہ کبھی ہائی سکول نہیں گیا تھا۔ وہ ابھی چالیس برس کا ہوا تھا کہ وہ فوت ہو گیا۔ لیکن وہ اپنے پیچھے اکاون کتابیں چھوڑ گیا۔

وہ جیک لندن تھا۔۔ "جنگل کی پکار" کا مصنف۔

جب جیک لندن نے 1903ء میں ''جنگل کی پکار'' لکھی تو وہ ایک رات کے اندر اندر مشہور ہوگئی۔ ایڈیٹر کہانیوں کے لیے اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ لیکن اسے اپنی پہلی مشہور کتاب کا بہت کم معاوضہ ملا۔ ناشروں اور بعد میں ہالی وڈ کے فلم سازوں نے اس کی کتاب سے دو لاکھ پونڈ کمائے۔ لیکن اس نے ''جنگل کی پکار'' کے جملہ حقوق فقط چار سو پونڈ میں فروخت کیے تھے۔

اگر آپ کوئی کتاب لکھنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے آپ کے پاس لکھنے کے لئے مواد ہونا چاہیے۔ جیک لندن کی حیرت ناک کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ اس کی مختصر مگر ولولہ انگیز زندگی کی دس ہزار رنگا رنگ تجربات سے بھری پڑی تھی۔ وہ جہاز ران، قزاق اور کان کن رہ چکا تھا۔ اس نے نصف دنیا کے گرد چکر لگایا تھا۔ اور ایک خستہ حال نوجوان کی حیثیت سے اس نے اپنے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی۔ وہ اکثر بھوکا رہتا۔ وہ پارکوں میں پڑے ہوئے بچھوں گھاس کے گھٹوں اور مال گاڑی کے ڈبوں میں سوتا تھا۔ وہ اکثر ننگی زمین پر سوتا تھا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود اپنے آپ کو پانی میں سویا ہوا پایا۔ بعض دفعہ وہ اس قدر تھکا ہوا ہوتا کہ مال گاڑی کی سلاخ سے لٹکا لٹکا سو جاتا۔

اس نے سینکڑوں دفعہ جیل کی ہوا کھائی۔ وہ میکسیکو، منچوریا، جاپان اور کوریا کے قید خانوں کی سیر بھی کر آیا تھا۔

جیک لندن کا بچپن افلاس اور سختیوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ قزاقوں کے ایک ایسے گروہ کا کارکن بھی رہ چکا تھا۔ جو خلیج سان فرانسسکو کے لمبے ساحلوں پر جہاز لوٹا کرتا

تھا۔ سکول جانے کے خیال پر وہ قہقہہ لگاتا اور زیادہ وقت جوا کھیلتا رہتا تھا۔ ایک دن وہ یونہی گھومتا گھومتا ایک پبلک لائبریری میں چلا گیا اور بیٹھ کر "روبن سن کروسو" پڑھنے لگا۔ اس کتاب نے اسے مسحور کر دیا۔ بھوکا ہونے کے باوجود وہ اس دن گھر کھانا کھانے نہ گیا۔ دوسرے دن وہ کوئی اور کتاب پڑھنے کے لیے بھاگا بھاگا لائبریری گیا۔ اس کے سامنے ایک نئی دنیا کے دروازے کھل رہے تھے۔ اب کہ لاف لیلی اس کے ہاتھ لگی۔ اس وقت کے بعد کتابوں کے مطالعہ کی ایک ناقابل تسکین پیاس اس پر مسلط ہوگئی۔ اکثر وہ ایک دن میں دس سے پندرہ گھنٹے مطالعہ کرتا۔ "نک کارٹر" سے "شیکسپیئر" تک اور ہربرٹ سپنسر سے کارل مارکس تک جو کتاب بھی اس کے ہاتھ لگی۔ اس نے پڑھ ڈالی۔ جب وہ انیس برس کا ہوا تو اس نے جسمانی محنت کی بجائے دماغی محنت کرنے کا تہیہ کر لیا۔ وہ آوارگی، سپاہیوں اور ریلوے ملازمین کی مار سے تنگ آ چکا تھا۔

لہذا انیس برس کی عمر میں وہ لوک ہنڈ (کیلی فورنیا) کے ایک ہائی سکول میں داخل ہوگیا۔ وہ دن رات پڑھتا۔ وہ نیند کی بھی پرواہ نہ کرتا تھا۔ اس نے چار سال کا نصاب تین ماہ میں ختم کر دیا۔ اور امتحان پاس کر کے کیلی فورنیا یونیورسٹی داخل ہو گیا۔

ایک بڑا ادیب بننے کے جذبے کے تحت "ٹریژر آئی لینڈ" دی کاونٹ آف مانٹی کرسٹو" اور "اے ٹیل آف ٹو سٹی" کو بار بار پڑھا۔ اور پھر ایک آتشیں جذبے کے تحت لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ ہر روز پانچ ہزار الفاظ لکھتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیس دن میں ایک مکمل ناول۔۔۔ بعض اوقات مختلف ایڈیٹروں کے پاس اس

کی تیس کہانیاں ہوتیں۔ لیکن وہ سب واپس آ جاتیں۔ ابھی تو وہ اپنا کام سیکھ رہا تھا۔

پھر ایک دن اس کی "جاپان کے ساحل پر طوفان نامی" ایک کہانی نے کہانیوں کے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا۔ اس کہانی کے اسے فقط چار پونڈ ملے۔ لیکن اس خستہ حالی میں یہ چار پونڈ بھی اس کے لئے ایک جاگیر سے کم نہ تھے۔

وہ 1986ء کا سال تھا۔ ایک ڈرامائی اور ولولہ انگیز سال۔ کلن ڈائک میں سونا دریافت ہوا تھا۔ یہ خبر آگ کی طرح سارے امریکہ میں پھیل گئی۔ اور امریکی قوم پاگل ہو گئی۔ دکان داروں نے دکانیں، سپاہیوں نے فوج، کسانوں نے زمین اور تاجروں نے اپنا کاروبار چھوڑ دیا۔ ہو کوئی سونا حاصل کرنے کی ہوس میں بھاگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ٹڈل دل وہاں جمع ہو گیا۔

جیک لنڈن بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ وہ پورے ایک برس تک سونے کی کھوج میں سرگرداں رہا۔ اس جد وجہد میں اس نے ناقابل یقین حد تک سختی برداشت کی۔ وہاں انڈے کی قیمت ایک روپیہ اور مکھن بارہ روپے پونڈ کے حساب سے فروخت ہونے لگا۔ وہ سردیوں میں یخ بستہ زمین پر سوتا رہا۔ آخر کار وہ خستگی کی حالت میں امریکہ چلا آیا۔

اس نے گھٹیا سے گھٹیا کام بھی کیا۔ اس نے ہوٹلوں میں برتن صاف کیے۔ فرشوں پر جھاڑو دیا۔ وہ جہازوں اور کارخانوں میں کام کرتا رہا۔

پھر جب ایک دن جب کہ اس کا کل اثاثہ دس شلنگ تھا۔ اس نے جسمانی محنت ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنا سارا وقت ادب کے لئے وقف کرنا چاہتا تھا۔ وہ سنہ

1898ء کا تھا۔ پانچ برس بعد وہ اپنی چھ کتابیں اور ایک سو پچیس کہانیاں شائع کرا چکا تھا۔ اور ادبی دنیا میں اس کا سب سے زیادہ چرچا تھا۔

جیک لندن نے 1916ء میں وفات پائی۔ ادبی زندگی کرنے کے فقط اٹھارہ برس بعد، اس نے تین ناول فی سال کے حساب سے لکھے۔ ان کے علاوہ ان گنت کہانیاں۔

اس کی سالانہ آمدنی امریکہ کے صدر کی سالانہ آمدنی سے دگنی تھی۔ اس کی کتابیں آج بھی یورپ میں بے حد مقبول ہیں۔ اس کا شمار ان امریکی ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی کتابیں دنیا بھر میں پڑھی جاتی ہیں۔

''جنگل کی پکار'' جس کا معاوضہ اسے فقط چار سو پونڈ ملا تھا، بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اس کی پندرہ لاکھ سے زیادہ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ اور وہ امریکی ادب کی مقبول ترین کتاب ہے۔



ولیم شیکسپئر

اس کے قصبے کے لوگوں نے اسے عزت کے ساتھ دفن کیا، کیونکہ وہ انہیں زیادہ شرح سود پر قرض دیا کرتا تھا

جب تک وہ زندہ رہا۔ اسے کسی نے بالکل اہمیت نہ دی۔ اس کی موت کے ایک سو برس بعد بھی اس کا نام گم نامی کے غبار میں چھپا ہوا تھا۔ لیکن اس وقت سے اب تک اس کے متعلق لاکھوں الفاظ کہے جا چکے ہیں۔ دنیا ادب میں اس سے زیادہ کسی ادیب کے بارے میں نہیں لکھا گیا۔ ہر سال ہزاروں لوگ اس گھر کی زیارت کیلئے جاتے ہیں۔ جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔

ایک دفعہ 1921ء میں مجھے بھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں سٹراٹ فورٹ سے توڑی تک اکثر پیدل گھوما کرتا تھا۔ یہی وہ کھیت تھے۔ جنہیں جوانی کے ایام میں وہ عبور کر کے وہ اپنی محبوبہ این ویلی کو ملنے جایا کرتا تھا۔

اس وقت ولیم شیکسپئر کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک روز اس کا نام ادبی افق پر روشن ستارہ بن کر صدیوں چمکتا رہے گا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی جوان محبت کا انجام نہایت دردناک ہوگا۔ اور اسے برسوں دست تاسف ملنا پڑے گا۔

اس میں شک نہیں کہ ولیم شیکسپئر کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ اس کی شادی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اسے این ویٹلی سے والہانہ محبت تھی۔ لیکن وہ چاندنی رات کے

پچھلے پہروں میں ایک اور لڑکی این ہاتھاوے کے ساتھ بھی معاشقہ بازی کیا کرتا تھا ۔جب این ہاتھاوے کو معلوم ہوا کہ اس کا عاشق ایک دوسری لڑکی سے شادی کرنے کے لئے لائسنس حاصل کر رہا ہے ۔تو اس نے ہمسایوں کے گھر جا کر واویلا مچانا شروع کر دیا۔ اور انہیں بتایا کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے ۔لہذا ولیم کو اس کے ساتھ شادی پر مجبور کیا جائے ۔اس کے سادہ لوح اور دیانت دار دیہاتی ہمسایے ولیم کی اس حرکت پر لال پیلے ہو گئے ۔ان کا اخلاقی احساس ایک دم ابھر آیا۔ دوسرے دن ہی وہ قصبے کے ٹاؤن ہال میں گئے ۔اور متعلقہ افسر سے بات چیت کر کے ولیم شیکسپئر اور این ہاتھاوے کی شادی کی بات پکی کر آئے ، قانونی اعتبار سے ولیم شیکسپئر بھی این ہاتھاوے سے شادی کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

ولیم شیکسپئر کی بیوی اس سے آٹھ برس بڑی تھی ۔اور شروع ہی سے ان کی گھریلو زندگی بے حد تلخ ہو گئی ۔اس نے اپنے ڈراموں میں متعدد بار مردوں کو اپنی عمر سے بڑی عورتوں سے شادی نہ کرنے کی تنبیہ کی ہے ۔حقیقت یہ ہے کہ وہ این ہاتھاوے کے ساتھ بہت کم رہا۔ اس کی بیاہتا زندگی کا زیادہ تر حصہ لندن میں گزرا۔ اور وہ سال میں ایک آدھ بار ہی گھر جایا کرتا تھا۔

آج سٹراٹ فورٹ لندن کا ایک قصبہ ہے ۔چھوٹے چھوٹے باغیچوں میں گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکان اور بل کھاتی ہوئی صاف ستھری گلیاں۔ لیکن ولیم شیکسپئر کے زمانے میں یہ قصبہ بے حد غلیظ، افلاس زدہ اور بیماریوں کا مرکز تھا۔ پانی کے نکاس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اور گلیوں میں سوروں کی ٹولیاں عام پھرا کرتی

تھیں۔ اور ان کے ہتھے جو چیز چڑھتی اسے ہضم کر جاتے تھے۔ ولیم شیکسپیئر کا والد قصبے کا ایک معزز باشندہ تھا۔ لیکن ایک دفعہ اپنے گھر کے سامنے اسے غلاظت کا ڈھیر جمع کر رکھنے پر اسے جرمانہ بھی کیا گیا۔

ہم بعض اوقات سوچتے ہیں کہ ہمارے دن بڑے سخت اور تلخ ہیں۔ لیکن ولیم شیکسپیئر کے زمانے میں سٹراٹ فورڈ کی نصف آبادی دوسروں کی خیرات اور مدد پر گزارا کرتی تھی۔ لوگوں کی بڑی تعداد ناخواندہ تھی۔ نہ تو ولیم شیکسپیئر کا والد اور نہ ہی والدہ اور نہ اس کے بہن بھائی اور نہ ہی اس کی اولاد پڑھنا لکھنا جانتی تھی۔

وہ شخص جس نے انگریزی ادب کی عظمت اور انگریزی ادبی قوت متحرکہ بننا تھا، اسے مالی مجبوریوں کی بنا پر تیرہ برس کی عمر میں تعلیم ترک کر کے کام پر جانا پڑا، اس کا والد دستانے بنانے کے علاوہ کھیتی باڑی کرتا تھا۔ ولیم شیکسپیئر اپنے والد کے ہمراہ بھینسوں کا دودھ دوہتا، بھیڑیں چراتا، دودھ سے مکھن نکالتا اور باپ کے ہمراہ ہڈیاں اور چمڑہ صاف کرتا۔

لیکن جب ولیم شیکسپیئر فوت ہوا تو وہ اپنے زمانے کے معیار زندگی کے لحاظ سے امیر تھا۔ لندن آنے کے پانچ برس کے اندر اندر ایک ایکٹر کی حیثیت سے وہ خاصی رقم کما رہا تھا۔ اس نے دو تھیٹروں میں اپنے حصے خرید لیے۔ اور وہ زیادہ شرح سود پر لوگوں کو قرض بھی دینے لگا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس کی سالانہ آمدنی تین سو پونڈ ہو گئی۔ لیکن اس زمانے میں ضرورت زندگی آج کے مقابلے میں بارہ گنا کم تھیں۔ جب ولیم شیکسپیئر پینتالیس برس کا ہوا تو اس کی سالانہ آمدنی چار ہزار پونڈ تھی۔

لیکن آپ کے خیال کے مطابق وہ اپنے وصیت نامے میں اپنی بیوی کے نام کس قدر رقم لکھ گیا ہوگا۔ ایک پائی بھی نہیں۔ فقط بستر کی دو چادریں، اور وہ بھی اس نے وصیت لکھنے کے بعد حرف مکدر کے طور پر لکھی تھیں۔

اس کے تمام ڈرامے ایک کتاب کی شکل میں شائع ہونے سے سات برس پہلے ہی ولیم شیکسپئر فوت ہوگیا۔ اگر آج آپ امریکہ میں کسی کتاب کا اصلی مسودہ خریدنا چاہیں تو اس کے لئے آپ کو اڑھائی لاکھ پونڈ دینے پڑتے ہیں۔ لیکن ولیم شیکسپئر اپنے "ہیملٹ" اور "میکبتھ" کا معاوضہ ایک سو پونڈ سے زیادہ حاصل نہ کرسکا۔

ڈاکٹر ایس۔ اے۔ ٹینین بام نے ولیم شیکسپئر کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ایک دفعہ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ شیکسپئر کے لکھے ہوئے ڈرامے اسی ولیم شیکسپئر کی تخلیق ہیں جو سٹراٹ فورڈ میں رہتا تھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس کے متعلق مجھے اتنا ہی یقین ہے کہ جتنا اس بات کا کہ ابراہام لنکن نے اپنی شہرہ آفاق تقریر گیٹس برگ میں کی تھی۔ اس کے باوجود بہت سے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ولیم شیکسپئر نام کا کوئی شخص نہ تھا۔ اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس کے ڈرامے سر فرانسس بیکن یا ارل آف آکسفورڈ کی تخلیقات ہیں، درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔

میں نے اکثر ولیم شیکسپئر کی قبر کے سامنے کھڑے ہوکر یہ کتبہ پڑھا ہے کہ

اچھے دوستو! میں تمہیں یسوع کے نام کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری خاک کریدنے کی کوشش نہ کرنا، اچھے لوگو میری ہڈیوں پر رحم کرو۔ اگر تم نے انہیں کریدا تو خدا کا

عتاب نازل ہوگا۔

اسے قصبے کے گرجے کے معبد کے سامنے دفن کیا گیا۔ آخر اسے یہ امتیازی جگہ کیوں ملی؟۔ اس کی ادبی عظمت کے سبب؟۔ بالکل نہیں۔ یہ شاعر جس نے ادبی ستارہ بن کر چمکنا تھا۔ اسے چرچ میں محض اس لئے جگہ دی گئی کہ وہ لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا۔ اگر یہ شخص جس نے شائی لاک کا کردار تخلیق کیا تھا۔ اپنے قصبے کے لوگوں کو قرض نہ دیا کرتا تو اس کی ہڈیاں آج کسی گم نام قبر میں گل سڑ چکی ہوتیں۔

☆☆☆

سنکلیر لیوس

وہ چھ ماہ تک دن رات لکھتا رہا مگر اس عرصہ میں فقط چھ شلنگ کما سکا

سنکلیر لیوس سے میری پہلی ملاقات بیس برس پہلے ہوئی تھی۔ کئی برس گزر گئے۔ میں اور نصف درجن دوسرے لڑکے لانگ آئی لینڈ میں فری پورٹ کے مقام پر کرایے کی موٹر بوٹ لے کر سمندر میں مچھلیاں پکڑنے جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں میں سنکلیر لیوس کی اس لئے عزت کرتا تھا کہ وہ کبھی سمندر کی ہیبت سے نہ گھبرایا تھا۔ سمندر کی سرکش موجیں کشتی کو ادھر ادھر اچھالتی رہتیں۔ اور اس کے ساتھ ہی میں بھی کشتی میں ادھر ادھر لڑھکتا رہتا۔ لیکن لیوس اپنی جگہ جم کر یوں مچھلیاں پکڑنے میں مصروف رہتا کہ جیسے کسی تصویر پر کوئی شکاری مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہو۔

آج بھی میں سنکلیر لیوس کی اسی طرح عزت کرتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ وہ اچھا شکاری ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس نے ان گنت اچھے ناول لکھے ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہیں تو پڑھ کر دیکھ لیں۔

سنکلیر لیوس پہلی دفعہ 1920ء میں منظر عام پر آیا۔ اس سے پہلے وہ چھ کتابیں لکھ چکا تھا۔ مگر انھوں نے ادبی دنیا میں ہلکا سا بھی ارتعاش پیدا نہ کیا۔ اس کا ساتواں ناول بڑا بازار تھا۔ اس نے انگریز ممالک کو ایک طوفان کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ عورتوں کے کلبوں نے اس کی مذمت کی۔ پادریوں نے اسے کوسا۔ اور اخباروں

رسالوں نے اس پر کڑی تنقید کی۔سارے امریکہ میں اس ناول نے ایک ادبی جنگ کا آغاز کر دیا۔اور تین ہزار میل دور یورپ میں بھی اس کے اثرات نمودار ہونے لگے۔

اس ناول نے اسے صف اول کا ادیب بنا دیا۔بعض نقادوں نے کہا "یہ ناول عجیب ہے" لیکن "بے پردہ دوبارہ ایسا ناول نہ لکھ سکے۔" لیکن مینسوچوتا سے آنے والا سرخ بالوں والا یہ لڑکا جم کر کام کرنے بیٹھ گیا اور اس نے مزید نصف درجن بکری کے لحاظ سے بہترین ناول لکھ مارے۔سنکلیر لیوس کے ناولوں کے متعلق یہ الفاظ لکھنا زیادتی ہے۔وہ تو اپنی کتابوں پر بے حد محنت کرتا اور بار بار ان پر نظر ثانی کرتا تھا۔

اس نے "ایروسمتھ نامی" اپنے ایک ناول کا خاکہ ساٹھ ہزار الفاظ میں لکھا۔یعنی ایک متوسط ناول سے زیادہ طویل محض ایک ناول کا ڈھانچہ۔۔ایک دفعہ وہ اپنے ناول پر پورے بارہ ماہ کام کرتا رہا۔لیکن پھر بھی اسے پسند نہ آیا۔اور اس نے اسے ٹوکری میں ڈال دیا۔

اس نے "بڑا بازار" تین مختلف دفعہ لکھنا شروع کیا۔اسے مکمل کرنے سے سترہ برس پہلے اس نے وہ لکھنا شروع کیا تھا۔

ایک دفعہ میں نے سنکلیر لیوس سے پوچھا کہ وہ اپنے بارے کوئی حیرت ناک حقیقت بتائے۔اس نے لمحہ بھر سوچا اور پھر کہنے لگا اگر میں نے ادبی کام کا آغاز نہ کیا ہوتا، تو آکسفورڈ یونیورسٹی میں یونانی زبان یا فلسفہ پڑھانے کو ترجیح دیتا۔یا پھر جنگلوں وغیرہ میں جا کر شکار کرتا اور وہیں رہتا۔

سال میں وہ چھ ماہ ایونیو، نیو یارک میں رہنا پسند کرتا، لیکن باقی چھ ماہ وہ برکلنس

سے جنوب مشرق کی طرف اسی میل دور مونٹ پہاڑوں میں ایک الگ تھلگ جگہ پر گزارتا۔ وہاں اس کی 340 ایکڑ زمین تھی۔ جس پر اس نے نیشکر اور سبزیاں لگا رکھی تھیں۔ وہاں اس نے گنے سے خود ہی شربت تیار کرنے کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ وہ قریبی قصبے میں صرف اسی صورت میں جاتا، جب اسے حجامت بنوانا ہوتی۔

میں نے اس سے پوچھا، کیوں تمہیں مشہور ہونا کیسا لگا ہے؟۔ اس نے جواب دیا ''بالکل بکواس'' اگر میں اپنے سارے خطوں کا جواب لکھنے بیٹھ جاؤں تو ایک کتاب بھی نہ لکھ پاؤں۔ اور تو اور رات کی نیند بھی میرے نصیب میں نہ رہے۔ لہذا وہ اپنے بیشتر خط آتش دان میں جلا دیتا تھا۔ اور انہیں جلتے ہوئے دیکھتا رہتا۔

اسے آٹوگراف دینا پسند نہیں۔ وہ شاذ ہی عوامی دعوتوں میں جاتا ہے۔ وہ ادبی محفلوں میں جانا بھی پسند نہیں کرتا۔

جب میں نے اس سے اس کی ابتدائی جدوجہد کا ذکر کیا تو کہنے لگا۔ ''اپنی ابتدائی جدوجہد کا ذکر کرنے والے ادیب مجھے برے لگتے ہیں۔'' دراصل زیادہ ادیبوں نے جدوجہد کی ہی نہیں ہوتی۔ پیشہ خواہ کوئی بھی ہو اس میں قدم جمانے کے لئے ابتدا میں ہر شخص کو محنت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن ایسے ادیب تو اپنی تکلیفوں کا ذکر کر کے اپنی اہمیت منوانا چاہتے ہیں۔

میں نے اسے یاد دلایا کہ وہ کئی برس پہلے ناشتے سے دو گھنٹے پہلے اٹھا کرتا تھا۔ اور کچن میں چولہے پر چائے کا پانی رکھ کر وہیں لکھنے کے لئے بیٹھ جایا کرتا تھا۔ میں نے اسے یہ بھی یاد دلایا کہ ایک دفعہ اس نے تین پونڈ ادھار لیے تھے۔ اور چھ ماہ تک

وہ اپنا کھانا خود ہی پکاتا تھا۔ اور اپنے کپڑے بھی خود ہی دھوتا تھا۔ اس دوران میں وہ فقط ایک لطیفہ دس شیلنگ میں فروخت کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے کہا کہ اس میں تو اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ وہ اپنا کام سیکھ رہا تھا۔ اور وہ سال اس کی زندگی کے بہترین سال تھے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ اب تک اس کی ناولوں کی کتنی جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ جواب میں اس نے کہا کہ اسے معلوم نہیں، اس نے کبھی اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا "بڑا بازار" سے اس نے کتنی رقم کمائی تھی۔ اس نے جواب دیا کہ حقیقتاً اسے یہ بھی معلوم نہ تھا۔ اس قسم کے کاموں سے نمٹنے کے لئے اس نے ایک وکیل اور ایک اکاؤنٹنٹ رکھا ہوا ہے۔ یہ سب حساب کتاب وہی جانتے ہیں۔ اسے تو لکھنے سے غرض تھی۔

اسے ہر قسم کا تجربہ تھا۔ مینسوچوتا میں اس کا والد ایک ڈاکٹر تھا۔ سنکلیر لیوس اپنے والد کے ہمراہ کام کیا کرتا تھا۔ اور آپریشن سے پہلے مریض کو کلوروفارم دیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے باربرداروالی کشتی میں کام کر کے بحیرہ اوقیانوس کو عبور کیا۔ ایک زمانے میں وہ بچوں کے لئے نظمیں لکھا کرتا تھا۔ اور امریکی ادیب جیک لندن کے پاس کہانیوں کے پلاٹ فروخت کیا کرتا تھا۔ وہ گونگوں اور بہروں کے ایک رسالے کا مدیر بھی رہ چکا تھا۔

اس نے زندگی میں ورزش کبھی نہیں کی۔ وہ جارج جین ناتھاں کی اس بات سے

متفق تھا۔ کہ ایک شہری آدمی کے لئے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اس میں داخل ہونا ہی خاص ورزش ہے۔

اسے کھیلوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔ بیس بال کے میدان میں اسے صرف بیب رتھ کا نام یاد ہے۔ اور فٹ بال کے سلسلے میں اس نے ریڈ گرینج کا نام سن رکھا ہے۔

''تمہیں پہلے تین اخباروں سے نکال دیا گیا تھا؟۔'' میں نے پوچھا ''تین نہیں چار اخباروں سے اس نے جواب دیا۔''

میرے یہ پوچھنے پر کہ وہ مبتدی ادیبوں کو کیا مشورہ دینا چاہتا ہے۔ وہ کہنے لگا کس قسم کا مشورہ۔ کسی شخص کو کسی قسم کا مشورہ دینے پر میرا یقین نہیں ہے۔

ایک دن اسے کسی شخص نے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ اس برس اسے ادب کے شعبے میں نوبل پرائز ملنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ سنکلیر لیوس نے سمجھا کہ اس کا کوئی دوست اسے مذاق کر رہا ہے۔ وہ بھی جواب دینے میں اسے مذاق کرنے لگا۔

لیکن چند منٹ بعد جب سنکلیر لیوس کو معلوم ہوا کہ نوبل پرائز کی بات مذاق نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت ہے، تو وہ بے حد گھبرایا۔ اسے ادبی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز حاصل ہو گیا تھا۔



چارلس ڈکنز

اسے اپنی کتابوں کا معاوضہ تین پونڈ فی لفظ کے حساب سے ملتا تھا۔

تقریباً ایک سو برس پہلے کرسمس کے موقع پر لندن میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی ۔۔ ایک ایسی کتاب جس نے غیر فانی بننا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اسے دنیا کی عظیم ترین چھوٹی کتاب کا درجہ دیا ہے۔ جب یہ کتاب پہلے پہل شائع ہوئی تو دوست جہاں کہیں بھی ایک دوسرے سے ملتے، سب سے پہلے یہی پوچھتے کہ "کیا تم نے وہ کتاب پڑھی ہے؟" اور ہر کوئی یہی جواب دیتا "ہاں پڑھی ہے ۔" خدا اس کے لکھنے والے پر رحمت نازل کرے۔

جس دن وہ کتاب شائع ہوئی ۔ اس روز اس کی ایک ہزار جلدیں فروخت ہو گئیں ۔ پندرہ دن کے اندر پریس نے اس کی مزید پندرہ ہزار جلدیں شائع کر دیں ۔ اس دن سے اس کتاب کے ان گنت ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔ اور وہ دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو چکی ہے ۔ چند برس پہلے جے، پی، مورگانا نے اس کتاب کا اصلی مسودہ بہت بڑی رقم خرچ کر کے خریدا تھا، اور اب وہ نیو یارک میں اس کی دوسری بیش قیمت اشیاء کے ساتھ اس کی آرٹ گیلری میں موجود ہے۔

اس عالمی شہرت یافتہ کتاب کا کیا نام ہے ۔۔۔ چارلس ڈکنز کی "کرسمس گیت"

تقدیر نے چارلس ڈکنز کو انگریزی ادب کا محبوب ترین ادیب بنانا تھا۔ اس کے

باوجود جب اس نے لکھنا شروع کیا تو وہ دوستوں کے مذاق سے اس قدر خائف تھا کہ اس نے اپنی پہلی کہانی کا مسودہ رات کی تاریکی میں ڈاک کے سپرد کیا کہ اسے کوئی دیکھ نہ لے۔ اس وقت وہ بائیس برس کا تھا۔ اور جب اس کی پہلی کہانی شائع ہوئی تو وہ سارا دن بے مقصد گلیوں میں گھومتا رہا۔ خوشی کے آنسو اس کے گال بھگو رہے تھے۔

اس کہانی کا معاوضہ اسے کچھ نہ ملا تھا۔ آپ کے خیال میں اس کی اگلی آٹھ کہانیوں کی اشاعت پر اسے کتنے پیسے ملے ہوں گے۔ بالکل کچھ بھی نہیں۔ آخر جب اسے معاوضہ ملنا شروع ہوا تو سب سے پہلے اس کے نام ایک پونڈ کا چیک آیا۔ جی ہاں اس کی پہلی کہانی کا معاوضہ فقط ایک پونڈ تھا۔ لیکن اسے اپنے آخری ناول پر فی لفظ تین پونڈ کے حساب سے معاوضہ ملا۔ ادبی تاریخ میں اس قدر معاوضہ کسی ادیب کو نہیں ملا۔ غور کریں تین پونڈ فی لفظ!

لوگ بہت سے مصنفوں کو ان کی موت کے پانچ چھ برس بعد بھول جاتے ہیں۔ لیکن ڈکنز کی موت کے تریسٹھ برس بعد بھی اس کے ناشروں نے اس کے لواحقین کو 40,000 پونڈ ''کرسمس کا گیت'' کا معاوضہ دیا۔ یہ کہانی جو چارلس ڈکنز نے اپنے بچوں کے لئے لکھی تھی۔

گزشتہ ایک سو سال سے چارلس ڈکنز کے ناول بہت بڑی تعداد میں بک رہے ہیں۔ شکسپیئر کے ڈراموں اور بائبل کے بعد ان کا نام آتا ہے۔ تھیٹر اور فلمی دنیا میں دونوں جگہوں پر وہ بہت مقبول ہوئے۔

چارلس ڈکنز کی تعلیمی زندگی چار برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے باوجود اس نے انگریزی ادب کے سترہ بہترین ناول لکھے۔ اس کے والدین ایک اسکول چلاتے تھے۔ لیکن وہ کبھی اس سکول میں نہیں گیا تھا۔ کیونکہ وہ سکول لڑکیوں کے لئے تھا۔ سکول کے دروازے پر یہ الفاظ لکھے تھے۔ ''مسز ڈکنز کا سکول'' لیکن لندن میں ایک بھی ایسی لڑکی نہ تھی جو اس سکول میں پڑھنے کے لئے آتی ہو۔

سکول کا بل روز بروز بڑھ رہا تھا۔ قرض خواہ ہر روز اس کے والد کا دروازہ توڑتے تھے۔ آخر کار انہوں نے غصہ میں آکر اس کے والد کو قید کرادیا۔

چارلس ڈکنز کا بچپن بڑا تاریک اور قابل رحم تھا۔ جب اس کا والد قید ہوا۔ اس وقت اس کی عمر صرف دس سال تھی۔ کنبے کے لئے گزر اوقات کے لئے بھی کچھ نہ تھا۔ چارلس ڈکنز ہر روز کباڑے کی دکان پر جاتا اور گھر کی کوئی نہ کوئی بچی کھچی چیز فروخت کرتا۔ یہاں تک کہ اسے اپنی دس محبوب کتابیں بھی فروخت کرنا پڑیں۔ بعد میں وہ یہ کہا کرتا تھا۔ ''جب میں نے کتابیں فروخت کیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔''

آخر اس کی والدہ اپنے چاروں بچوں کو لے کر خود بھی اپنے شوہر کے پاس قید خانے میں رہنے لگی۔ چارلس سارا دن تو والدین اور بہن بھائیوں کے پاس گزارتا۔ لیکن شام کے وقت وہ اس تاریک کمرے میں چلا آتا، جہاں وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ان لڑکوں نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ آخر اسے ایک غلیظ کارخانے میں بوتلوں پر لیبل چسپاں کرنے کی نوکری مل گئی۔ پہلی تنخواہ ملتے ہی اس نے

دوسرا کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ وہ کمرہ بھی بے حد خستہ حال تھا۔ اور اس کے گوشے میں ہر وقت غلاظت کے ڈھیر پڑے رہتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کمرہ چارلس ڈکنز کے نزدیک ایک بہشت سے کم نہ تھا۔

بعد کے ایام میں چارلس ڈکنز نے ''آلیور ٹوسٹ'' کا کردار تخلیق کر کے اپنے بچپن کا انتقام لے لیا۔

چارلس ڈکنز نے گھریلو زندگی کے متعلق بڑے جامع اور عمدہ مناظر لکھے ہیں۔ اس کے باوجود اس کی بیاہتا زندگی بے حد ناکام اور ایک المیے سے کم نہ تھی۔ اسے تیئس برس تک ایک ایسی بیوی کے ساتھ رہنا پڑا جسے وہ بالکل پیار نہیں کرتا تھا۔ اس بیوی نے اس کے دس بچوں کو جنم دیا۔ لیکن سال بہ سال اس کے دکھوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ساری دنیا اس کے قدموں میں بچھی ہوئی تھی۔ لیکن اس کا اپنا گھر تلخیوں کا مجمع تھا۔ آخر کار اس کی گھریلو زندگی اس قدر تلخ ہوگئی کہ اس کی قوت برداشت مزید متحمل نہ ہو سکی۔ لہٰذا اس نے ایک غیر متوقع بات کر دکھائی۔ اس نے اپنے رسالے میں اعلان کر دیا کہ وہ اور اس کی بیوی ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں۔ کیا اس نے اس بات کا الزام اپنے سر لیا۔ نہیں بالکل نہیں۔۔ اس سلسلے میں اس نے سارا الزام اپنی بیوی کے سر ڈالنے کی کوشش کی۔

چارلس ڈکنز سخاوت کا مجسمہ تصور کیا جاتا تھا۔ جب وہ فوت ہوا تو اپنی سالی کے لئے 40,000 پونڈ چھوڑ گیا۔ لیکن اپنی بیوی کے لئے وصیت نامے میں فقط سات پونڈ ہفتہ وار وظیفہ لکھ گیا۔ فقط سات پونڈ ہفتہ وار!

وہ ایک مور کی طرح مغرور اور حساس تھا۔ ذراسی تنقید اسے تیخ پا کرنے کے لئے کافی ہوتی تھی۔ اسے اپنے چہرے کے خدوخال پر بڑا ناز تھا۔ جب 1842ء میں وہ پہلی دفعہ امریکہ گیا تو اس کا رنگین لباس دیکھ کر وہاں کے لوگ حیران رہ گئے۔ وہ عوامی جگہوں پر لوگوں کے سامنے بالوں میں کنگھی کیا کرتا تھا۔ اس کی عجیب وغریب حرکتوں پر لوگ حیران ہونے لگتے۔ آخر انھوں نے اسے تنگ کرنے کی ترکیب سوچی۔ وہ نیویارک کی جس گلی میں جاتا تو لوگ اپنے سور گلیوں میں کھلے چھوڑ دیتے۔ اور ان کو یوں آزادانہ گھومتے دیکھ کر چارلس ڈکنز خوف زدہ ہو جاتا تھا۔

جس قدر پیار لوگوں نے چارلس ڈکنز سے کیا۔ شاید ہی کسی دوسرے کو نصیب ہوا ہو۔ جب وہ دوسری دفعہ امریکہ آیا تو لوگ اس کی تقریر سننے کے لئے کڑی سردی میں ٹکٹ خریدنے کی خاطر قطاریں باندھے کھڑے رہتے۔ اور وقت گزارنے کی خاطر آگ روشن کر کے تاپتے رہتے۔ ایک دفعہ جب تمام ٹکٹ فروخت ہو گئے اور سینکڑوں لوگوں کو مایوس جانا پڑا تو انہوں نے فساد بپا کر دیا۔

ادبی تاریخ متضاد کرداروں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن چارلس ڈکنز جیسا متضاد شاید ہی کوئی کردار ہو۔



تھیوڈور ڈریسر

بعض اوقات وہ اس لیے سکول نہ جا سکتا کہ اس کے پاس جوتے نہ ہوتے تھے۔

تھیوڈور ڈریسر امریکہ کا ایک نمایاں اور حیرت انگیز ناول نگار تھا۔ پچیس برس تک اس نے امریکہ کے ادبی حلقوں میں تہلکہ مچائے رکھا۔ امریکی ادب پر اس کا بے حد اثر تھا۔ اگر تھیوڈور ڈریسر پیدا نہ ہوتا تو جو کتابیں آپ آج کل پڑھتے ہیں مختلف انداز کی ہوتیں۔

1900ء میں اس نے "سسٹر کیری نامی" ایک سنسنی خیز ناول لکھا۔ اس ناول نے ادبی حلقوں میں ایک متضاد بحث کا آغاز کر دیا۔ نقادوں نے اسے غیر اخلاقی اور فحش قرار دیا۔ مذہبی مبلغوں نے معبدوں میں کھڑے ہو کر اس کی مذمت کی اور خواتین کی انجمنوں نے مشتعل ہو کر اس کی فروخت پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ ناول کا ناشر بے حد ہراساں ہو گیا۔ اور اس نے ناول فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ تھیوڈور ڈریسر بہت حیران ہوا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر ناول میں کون سی بات غیر اخلاقی تھی۔ اس نے زندگی کو جس طرح دیکھا تھا۔ ہو بہو اس کی عکاسی کی تھی۔ لیکن وہ 1900ء کا زمانہ تھا۔ اب کوئی شخص اس ناول پر غیر اخلاقی ہونے کا الزام نہیں لگا سکتا تھا۔ اگر آپ "سسٹر کیری" کے پہلے ایڈیشن کی کوئی جلد خریدنا

چاہتے ہیں تو اس کے لئے آپ کو بہتر پونڈ خرچ کرنا پڑیں گے۔ ایک دفعہ میں اس حیرت ناک آدمی سے ملنے گیا۔ وہ اس قدر بے تکلف واقع ہوا کہ میں حیران رہ گیا۔

جب کبھی وہ کسی پارٹی وغیرہ میں جاتا تو ایک مسئلہ بن جاتا۔ کیونکہ وہ اپنے خیالات کو بغیر کسی ردوبدل کے من وعن بیان کر دیتا تھا۔ مثلاً ایک دفعہ ایک دعوت کے موقع پر روس کے متعلق ایک شخص سے بحث چھڑ گئی۔ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ اس نے اپنے مخالف کا احمق اور چور تک کہہ ڈالا۔

اس نے امریکی زندگی کے متعلق سب سے موثر المیہ ناول لکھا ہے۔ اس کا عظیم ناول ''ایک امریکی ٹریجڈی'' 1925ء میں شائع ہوا۔ اس زمانے میں اس کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ کمرے کا کرایہ دینے کے لئے بھی اس کے پاس پیسے نہ ہوتے تھے۔ لیکن اس ناول کی اشاعت نے امریکہ میں سنسنی پھیلا دی۔ اور اس کا معاوضہ اسے 80.000 ہزار پونڈ ملا، اس ناول کی فلم بنانے کے لئے ہالی ووڈ والوں نے اسے 40,000 پونڈ دیئے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس نے اتنی ساری رقم کا کیا کیا تھا۔ جواب دیا کہ میں نے بہت سے سٹاک اور بانڈز خریدے مگر مجھے 40,000 پونڈ کا خسارہ اٹھانا پڑا۔

تھیوڈور ڈریسر نچلے طبقے کے لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے کیونکہ وہ اس قسم کے ماحول میں پیدا ہوا اور وہیں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ ان کی ماں لوگوں کے کپڑے دھو کر اپنے تیرہ بچوں کے پیٹ پالنے کی کوشش کرتی۔ ننھے تھیوڈور ڈریسر کو اس ماحول میں اکثر بھوکا رہنا پڑتا۔ اس کے پاس سونے کے لئے کوئی بستر نہ تھا۔

لہٰذا وہ ایک کتے کی طرح سردی سے سکڑ کر گھاس پھوس کی چٹائی پر سو جاتا۔ بعض اوقات وہ اپنے گھر کو گرم کرنے کے لئے ریل کی پٹری پر سے چھوٹے چھوٹے کوئلے اٹھا لاتا۔ کئی دفعہ وہ محض اس لئے سکول نہ جاتا کہ اس کے پاس جوتے نہ ہوتے تھے۔

لیکن سکول میں وہ بڑا ضدی واقع ہوا تھا۔ جو چیزیں اسے پڑھنے کے لئے کہا جاتا۔ وہ ہمیشہ اس کی مخالفت کرتا تھا۔ اسے ریاضی اور گرائمر سے سخت نفرت تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے کبھی گرائمر کا مطالعہ نہ کیا۔ اور نہ ہی مستقبل میں اس قسم کا کوئی ارادہ ہے۔ اس نے قسم کھا کر کہا کہ اگر محکمہ تعلیم اس کے اختیار میں آ جائے تو وہ انگریزی ادب اور گرائمر کی تمام کلاسیں ختم کر دے۔ صحافت اور کہانیاں لکھنے کی کلاسیں بند کر دے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح کبھی کوئی ادیب نہیں ہو سکتا۔

تھیوڈور ڈریسر نے اچانک ایک روز فیصلہ کیا کہ وہ اخباری نمائندہ بنے گا۔ لہٰذا اس نے ''شکاگو گلوب'' میں ملازمت کے لئے درخواست دے دی۔ اخبار والوں نے جواب میں لکھا کہ انہیں مزید آدمی کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن وہ اخبار کے دفتر میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا، اور ان سے کہہ دیا کہ جب تک وہ اسے ملازم نہیں رکھیں گے۔ وہ وہاں سے ہرگز نہ ہلے گا۔ وہ ہر روز وہاں آتا اور صبح سے شام تک وہیں بیٹھا رہتا۔ ایک ماہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہ 1891ء کا ذکر ہے۔ جب اسی سال جون میں شکاگو میں ڈیموکریٹک نیشنل کنونشن منعقد ہونے کا وقت آیا تو اخبار کو ایک فالتو رپورٹر کی ضرورت پڑی۔ لہٰذا اسے اخبار میں جگہ مل گئی، تب ایک ناقابل یقین واقعہ

رونما ہوا۔ یہ نیا رپورٹر جس نے کبھی اخبار میں ایک سطر تک نہ لکھی تھی ۔ دوسرے رپورٹروں کے ہمراہ ایڈوٹوریم ہوٹل کی بار میں بادہ آشامی میں مشغول تھا۔ دوسرے رپورٹر کہہ رہے تھے کہ نہ جانے ڈیموکریٹک پارٹی صدر کے الیکشن کے لئے اپنا کون سا امیدوار نامزد کرے گی۔ ڈریسر نے دو چار جام چڑھا رکھے تھے۔ اور کھلنے کے موڈ میں تھا۔ اس نے اٹھ کر کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ ڈیموکریٹک پارٹی صدر کے لئے اپنا کون سا امیدوار نامزد کر رہی ہے، ایک غیر متوقع شخص، سینٹر ملکنٹی، اسی وقت سینٹر ملکنٹی بار روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اور کہنے لگا کہ ''میرا نام لے کر میری عزت افزائی کی ہے۔''

ڈریسر نے اپنا نام لیا۔ سینٹر ملکنٹی نے اس سے کہا بہت خوب، آؤ بیٹھ کر شراب پئیں۔ پانچ منٹ بعد اس نے ڈریسر کو کھانے کی دعوت دی۔ کھانے کے بعد سینٹر ملکنٹی نے اس سے کہا میرا خیال ہے کہ تم میرے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے میرے ساتھ واشنگٹن چلو۔

تھوڑی دیر بعد سینٹر ملکنٹی نے دوبارہ اسے مخاطب کر کے کہا ''لڑکے سنو میں تمہیں ایک راز بتانے والا ہوں۔'' صدر کے الیکشن کے سلسلے میں گروور کلیوی نیڈ کا نام منتخب ہو چکا ہے۔ تم پہلے اخباری نمائندے ہو جسے یہ بات معلوم ہوئی ہے۔

ڈریسر اس بات کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ حیران رہ گیا۔ اسے اخبار میں کام کرتے ہوئے فقط دو روز ہوئے تھے، اور اس نے سال کی اہم ترین خبر حاصل کر لی تھی۔

چند ماہ بعد اسے ایک دوسرے اخبار نے ملازمت کی پیش کش کی ۔ وہاں کام

کرتے ہوئے اسے تین ماہ گزرے تھے۔ کہ اخبار میں ڈراموں پر تبصرہ کرنے والے ایڈیٹر نے استعفیٰ دے دیا۔ اور یہ کام ڈریسر کے سپرد ہوا۔ وہ حیران تھا کہ یہ کام اس کے سپرد کیوں کیا گیا۔ کیونکہ وہ تھیٹر کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا۔

ایک رات سینٹ لوئس تھیٹر میں چار شو ہوئے تھے۔ ڈریسر فقط ایک شو دیکھ سکا۔ اور باقی تین کے متعلق انہیں دیکھے بغیر تبصرہ لکھ مارا۔ اس نے تبصرہ اس انداز میں لکھا کہ جیسے اس نے سب کچھ دیکھا ہے۔ اس نے بعض ایکٹروں کی اداکاری پر فقرے بھی چست کیے۔ دوسرے دن جب یہ تبصرہ اخبار میں شائع ہوا تو اسے پتا چلا کہ باقی تین شو ملتوی ہو گئے تھے۔

وہ اس قدر شرمندہ ہوا کہ اس نے اخبار سے استعفیٰ دے دیا۔

جب میں نے اس سے اس کی کامیابی کا راز پوچھا تو اس نے فقط اتنا کہا ''یہ سب خدا کی دین ہے۔''



لارڈ بائرن

ایک کامیاب عاشق، جو تمبا کو کھاتا، ناخن چباتا اور داد عشق دیتے دیتے خوب رو پیکروں کو ہڈیوں کا پنجر بنا کر رکھ دیتا تھا۔

آج سے سو برس پہلے بہترین عاشق کس قسم کا ہوتا تھا؟۔ کس قسم کا شخص ہماری دادیوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو تیز تر کر دیا کرتا تھا۔ اور ہمارے دادا آتش دان کے قریب بیٹھے حسد کی آگ میں جلا کرتے تھے۔؟۔ اس زمانے میں کون جون ڈاون، وانٹا ئنو اور کلارک گیبل ہوا کرتا تھا!

اس کا جواب بڑا آسان ہے۔ آج سے سو برس پہلے جہاں تک عورتوں کا معاملہ ہے۔ کوئی شخص بھی جارج گارڈن لارڈ بائرن کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔

وہ اپنے زمانے کا عظیم ترین شاعر تھا۔ اس کے اثر نے انیسویں صدی میں ادب کا رخ موڑ دیا۔ اس نے انگریزی ادب کی بہترین شاعری تخلیق کی ہے۔ اسے درجنوں عورتوں سے محبت تھی لیکن حیرت کی بات ہے کہ اسے اپنی سوتیلی بہن سے بے حد محبت تھی۔ ان کے معاشقے نے یورپ کو سخت صدمہ پہنچایا اور اس وجہ سے اس لڑکی کی زندگی تباہ ہوگئی۔ جب انھیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا گیا تو لارڈ بائرن نے اس حادثے پر ایک بہت خوبصورت نظم لکھی۔ جس کا ایک قطعہ یہ ہے۔

اگر ایک طویل مدت کے بعد
میں تم سے ملوں
میں تمہارا استقبال کیسے کروں گا
خاموشی اور آنسوؤں سے

جوں جوں لارڈ بائرن بدنام ہوتا گیا عورتوں کو اس سے زیادہ محبت ہوتی گئی۔ وہ اس حد تک اس کی پوجا کرتی تھیں کہ جب بائرن کی بیوی اس کی سرد مہری سے تنگ آکر اسے چھوڑ کر چلی گئی تو بہت سی عورتوں نے اس کی بیوی کو برا بھلا کہا۔ یہ عورتیں بائرن کو عشقیہ خطوط اور عشقیہ نظمیں لکھا کرتی تھیں۔ اور اپنے بالوں کے گچھے اسے بطور نذرانہ بھیجا کرتی تھیں۔ لندن کے ایک نہایت معزز گھرانے کی لڑکی لڑکوں جیسا لباس پہن کر فقط بائرن کو ایک نظر دیکھنے کے لئے گھنٹوں بارش میں ایک گلی کی نکڑ پر کھڑی رہتی تھی۔ ایک عورت اس کے عشق میں اس درجہ پاگل ہوگئی کہ جب بائرن کو برطانیہ سے جلاوطن کیا گیا تو وہ اس کے پیچھے اٹلی تک گئی اور آخر بائرن کے سمجھانے پر واپس آئی۔

اپنے زمانے کا یہ الفانسو، یہ عظیم عاشق آپ کے خیال میں کس قسم کا ہوگا۔ وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا۔ وہ ہروقت اپنے ناخن دانتوں سے چباتا رہتا، اور تمبا کو چوسا کرتا تھا۔ شکاگو کے کسی کاؤبوائے کی طرح وہ ہروقت اپنے پاس پستول رکھتا تھا۔ وہ بے حد تنک مزاج تھا۔ اگر کوئی غور سے اس کی طرف دیکھتا تو اس کا غصہ ایک دم بھڑک اٹھتا تھا۔ کیونکہ اسے یہ احساس ہروقت تنگ کرتا رہتا کہ لوگ شاید اس کی لنگڑی ٹانگ

کو دیکھ رہے ہیں ۔ یہ شاعر جسے اپنے زمانے کا رومیو کہا جاتا تھا۔ عورتوں کو اذیت دینے میں لذت حاصل کرتا تھا۔ اپنی شادی کے فقط دو گھنٹے بعد اس نے اپنی بیوی کو بتا دیا کہ وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ اور اس نے فقط رحم کھا کر اس سے شادی کی ہے۔ اور وہ ایک دن اس سے شادی کرنے پر پچھتائے گی۔ آخر ایسا ہی ہوا۔

وہ فقط ایک برس تک ازدواجی رشتے میں بندھے رہے۔ اگرچہ بائرن نے کبھی اسے مارا نہ تھا۔ لیکن وہ غصے میں گھر کا سامان توڑ دیتا۔ اس کے سامنے اپنی محبوباؤں کو گھر لے آتا۔ اس کی بیوی کو اس پر نیم پاگل ہونے کا شبہ ہونے لگا۔ اس سلسلے میں وہ اسے ایک ڈاکٹر کے پاس بھی لے گئی۔

اس کے ہمسائے اس کے بارے میں عجیب وغریب باتیں بتاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کی تمام ملازمائیں جوان لڑکیاں تھیں، جوان، خوب صورت اور خوش مزاج لڑکیاں، یہ لڑکیاں بائرن اور اس کے مہمانوں کو شراب پیش کرتیں۔ وہ انسانی کھوپڑیوں کے بنے ہوئے پیالوں میں شراب پیتے۔ بائرن نے یہ انسانی کھوپڑیاں پالش کرا رکھی تھیں۔ اور وہ صحرا میں پورے چاند کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔

بائرن کے جسم کی جلد اتنی سفید تھی۔ کہ اس کے قریب رہنے والی عورتیں اس کے جسم کو ایک روشن فانوس سے تشبیہہ دیا کرتی تھیں۔ لیکن وہ اس حقیقت سے ناواقف تھیں کہ وہ ایسا نظر آنے کے لئے کس قدر تکلیف برداشت کیا کرتا تھا۔ وہ یہ نہ جانتی تھیں کہ اس کی زندگی کا ہر دن، ہر ساعت موٹاپے کے خلاف مسلسل جنگ تھی۔ خود کو نازک اندام اور خوب صورت رکھنے کے لئے وہ اتنی ہلکی اور کم غذا کھاتا کہ ہالی وڈ

والے بھی ایسی غذا کے متعلق نہیں سوچ سکتے۔

مثلاً وہ دن میں فقط ایک بار کھانا کھایا کرتا تھا۔ اور وہ کھانا بھی تھوڑے سے چاولوں اور آلوؤں پر مشتمل ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تبدیلی غذا کے لئے وہ تھوڑے سے خشک بسکٹ کھاتا اور بعد میں سوڈا واٹر پی لیتا۔ خود کو فربہی سے بچانے کے لئے وہ باکسنگ، گھڑ سواری اور تیراکی کرتا۔ کرکٹ کھیلتے وقت وہ تین چار سوئیٹر پہنتا کہ پسینے سے اس کے جسم کی چربی پگھل جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ تر کی غسل بھی کیا کرتا تھا۔

اس مضحکہ خیز غذا نے اس کی قوت ہاضمہ تباہ کر دی۔ اس کی خواب گاہ میں دواؤں کے ڈھیر لگے رہتے اور وہ ایک عظیم عاشق کے گھر کی بجائے ایک کیمسٹ کی دکان دکھائی دیتی تھی۔

وہ اس قدر پریشان خواب دیکھا کرتا تھا کہ اس نے تنگ آ کر خواب آور گولیاں کھانا شروع کر دیں۔ لیکن یہ گولیاں بھی اس کے پریشان خوابوں کا مداوانہ بن سکیں۔ لہذا وہ دو بھرے ہوئے پستول ہر وقت اپنے سرہانے رکھتا۔ اکثر رات کی خاموشی میں وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور دانت پیس کر پستول ہاتھ میں پکڑ کر کمرے کے چکر لگانے لگتا۔

لارڈ بائرن جس مکان میں رہتا تھا۔ وہ آسیب زدہ تھا اور وہاں ایک پادری کی روح اکثر آیا کرتی تھی۔ بائرن قسم کھا کر کہا کرتا تھا کہ اس پادری کا آسیب اکثر اسے برآمدوں میں ملتا ہے۔ اور بری خوفناک آنکھوں سے اسے گھورتا ہے۔ یہی آسیب اس نے اپنی بدقسمت شادی کے دن بھی دیکھا تھا۔ جب وہ اٹلی میں تھا۔ تو اس نے

قسم کھا کر کہا تھا کہ اس نے شاعر شیلے کی روح ایک جنگل میں دیکھی تھی۔ اس لمحے شیلے اس سے ہزاروں میل دور تھا۔ اور بائرن بھی اس حقیقت سے واقف تھا۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد شیلے کی موت کی خبر اس تک پہنچ گئی۔ وہ سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ اور بائرن نے اسے اپنے ہاتھوں سے دفن کیا تھا۔

ایک اور توہم ہر وقت اس کا تعاقب کرتا رہتا تھا۔ ایک نجومی نے اسے بتایا تھا کہ وہ 37 برس کی عمر میں مر جائے گا۔ اپنی 36 ویں سال گرہ کے تین ماہ بعد وہ فوت ہو گیا۔ بائرن کا یقین تھا کہ کوئی مصیبت ان کے خاندان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ کہا کرتا تھا۔ کہ 36 واں ہندسہ اس کے خاندان کے لیے مہلک ہے۔ بعض جدید سوانح حیات لکھنے والے بائرن کے اس خیال سے متفق ہیں۔ بائرن کا والد بھی 36 برس کی عمر میں فوت ہوا۔ اور بائرن خود بھی بائرن کی بیٹی بھی اپنے دادا اور والد کی طرح 36 ویں سال گرہ پر فوت ہوئی تھی۔



ایڈورڈبوک

وہ چودہ برس کی عمر میں امریکہ کی تمام بڑی شخصیتوں کا انٹرویو لے چکا تھا

ایک روز ایک بھوکا بچہ سکول سے واپسی پر لذیذ بسکٹوں اور پیسٹریوں کا دور سے نظارہ کرنے کے لئے بیکری کی دکان کے سامنے رک گیا۔

دکان کا مالک اسے دیکھ کر باہر آیا اور کہنے لگا ''اچھی لگتی ہیں نا۔''

ضرور اچھی لگتی ہیں،'' چھوٹے ڈچ لڑکے نے جواب دیا۔ ''بشرطیکہ تمہاری دکان کی نمائشی کھڑکی صاف ہوتی۔

''اچھا یہ بات ہے۔'' چلو تم ہی صاف کردو۔

اور اس طرح ایڈورڈبوک کو اپنا پیٹ پالنے کے لئے پہلی ملازمت ملی۔ اس کام سے اسے دو شلنگ فی ہفتہ ملتے تھے۔ جو اس کے لئے قارون کے خزانے کے برابر تھے۔ کیونکہ اس کے خاندان کے لوگ اس قدر غریب تھے کہ وہ روزانہ ٹوکری اٹھا کر گندے نالے سے کوئلے چننے کے لئے جایا کرتے تھے۔ جو کوئلے سے چلنے والی گاڑیاں بے کار ہونے پر وہاں پھینک جاتی تھیں۔

یہ لڑکا ایڈورڈبوک جب امریکہ پہنچا تو انگریزی زبان سے اس قدر ناآشنا تھا کہ استاد کوئی بات کہتا تو یہ ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس نے زندگی کے صرف چھ برس

سکول میں گزارے تھے۔ اس کے باوجود اس نے امریکی صحافت کی تاریخ میں کامیاب اخبار نویس کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ اسے اس بات کا اعتراف تھا کہ وہ بالکل نہیں جانتا تھا۔ کہ عورتیں کس قسم کے مضامین پسند کرتی ہیں۔ اس کے باوجود اس نے خواتین کے لئے اتنا اچھا رسالہ نکالا۔ جس کا مقابلہ دنیا کا کوئی رسالہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس رسالے کی اشاعت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ جس ماہ اس نے اس رسالے سے علیحدگی اختیار کی، رسالے کی اشاعت □000, 2,000 تھی اور صرف ایک شمارے میں 200,000 پونڈ کے اشتہار شائع ہوئے تھے۔

ایڈورڈ بوک نے پورے تیس برس "لیڈیز ہوم جرنل" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر وہ ریٹائر ہو گیا۔ اور اپنی داستان حیات کتابی صورت میں قلم بند کی، جس کا نام امریکیانزیشن آف ایڈورڈ بوک ہے۔

بیکری کی دکان کے شیشے صاف کرنے کے بعد ایڈورڈ بوک نے اسی شدومد سے کام اکٹھے کرنے شروع کر دیا۔ جس شدومد سے دوسرے بچے ٹکٹیں جمع کرتے ہیں۔ اتوار کی صبح کو اخبار بیچتا۔ ہفتے کی دوپہر اور اتوار کی شام کو لیمن اور برف بیچتا۔ اور شام کے وقت مقامی اخباروں کے لئے سال گرہ پارٹیوں اور دوسری دعوتوں کی اطلاعات لکھتا۔ اس طرح وہ ہفتہ میں چار، پانچ پونڈ کمانے لگا۔ وہ یہ سارے کام سکول سے فارغ ہونے کے بعد کرتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ اور اسے امریکہ میں آئے ہوئے چھ برس ہوئے تھے۔

تیرہ سال کی عمر میں اس نے ویسٹرن یونین میں آفس بوائے کی حیثیت سے

ملازمت کرنے کے لئے سکول چھوڑ دیا۔ لیکن اس نے تعلیم کے خیال کو ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے اپنے آپ کو خود تعلیم دینا شروع کر دی۔ کئی روز تک بسوں میں سفر کرنے کی بجائے پیدل چل کر اور دو وقت کے کھانے کی بجائے ایک وقت کھانا کھا کر اس نے کچھ روپیہ پس انداز کیا۔ اور اس سے ''امریکی سوانح عمریوں کا انسائیکلوپیڈیا'' خرید لایا۔ پھر اس نے ایک ایسا کام کیا، جو اس سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا۔ وہ مشہور آدمیوں کی سوانح حیات پڑھنے کے بعد انہیں خط لکھتا اور ان سے درخواست کرتا کہ وہ اسے اپنے بچپن کے بارے میں زیادہ تفصیلی حالات بھیجیں۔ اس نے جنرل جیمز اے گارڈ فیلڈ کو جو اس وقت صدارتی انتخاب کا امیدوار تھا۔ خط لکھا اور پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ ایک بار اس نے نہر پر ایک معمولی مزدور کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ اس نے جنرل گرانٹ سے ایک لڑائی کی تفصیل پوچھی۔ گرانٹ نے اس کے لئے ایک نقشہ تیار کیا۔ اور اسے گھر پر کھانے کی دعوت دی اور دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔

اس طرح اس لڑکے نے جو پچیس شلنگ فی ہفتہ کے عوض تار گھر میں کام کر رہا تھا، اپنے وقت کے مشہور ترین لوگوں سے شناسائی حاصل کر لی۔ اس نے ایمرسن۔ فلپس بکس۔ اولا ئیور ینڈل ہومر۔ لانگ فیلو مسز ابراہیم لنکن۔ لوئیسا مے الکاٹ اور جنرل شرمن تک سے ملاقاتیں کیں۔

ان معزز لوگوں سے ملنے جلنے سے اس میں خود اعتمادی، وسعت نظر اور پیش قدمی کا جذبہ پیدا ہوا۔

ایک روز اس نے دیکھا کہ گلی میں ایک شخص نے سگرٹوں کا پیکٹ کھولا، اور اس میں سے ایک تصویر نکالی جو سگرٹ کمپنی کی طرف سے عطیے کے طور پر دی جاتی تھی۔ اور اسے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ ایڈورڈ بوک ہمیشہ نئے لوگوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ جن سے متعارف ہو سکے۔ چنانچہ اس نے تصویر اٹھائی اور اسے گور سے دیکھا۔ یہ ایک مشہور سیاست دان کی تصویر تھی۔ جس کے پیچھے تصویر کی پچھلی جانب سفید کاغذ تھا۔ بوک نے سوچا کہ اگر تصویر کی پچھلی جانب اس شخص کا تعارف ہوتا تو اسے اتنی بے دردی سے نہ پھینکا جاتا۔

اس طرح سے اسے اچھوتا خیال سوجھا۔ وہ دوسرے روز دوپہر کے وقفے میں اس کمپنی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جو تصویریں چھاپتی تھی۔ وہ اس کمپنی کے انچارج سے ملا۔ اس نے اتنے وثوق اور اعتماد کے ساتھ اپنے موقف کا اظہار کیا کہ وہاں اٹھنے سے پہلے اسے اس قسم کے مختصر تعارف کا سپلائی کرنے کا آرڈر مل چکا تھا۔ اور معاہدے کے مطابق ہر تعارف کا معاوضہ دو پونڈ تھا۔ بعد میں اسے اتنے آرڈر مل گئے کہ اس کے لئے یہ سارا کام خود کرنا مشکل ہو گیا۔ چانچہ اس نے بہت سے اخباری رپورٹروں کی خدمات حاصل کر لیں۔ جو ایک پونڈ کے عوض ایک تعارف دیتے تھے۔ اس طرح اسے ایک پونڈ کی بچت ہو جاتی۔

بعد میں اس نے تار گھر کی ملازمت چھوڑ دی اور نشر و اشاعت پر زیادہ توجہ دینے لگا۔

چھبیس سال کی عمر میں وہ ''لیڈیز ہوم جرنل'' کا چارج سنبھالنے کے لئے فلا ڈیلفیا گیا۔ اور پھر 56 سال کی عمر میں وہ یہ کہتے ہوئے خود ہی اس ذمہ داری سے

سبک دوش ہو گیا کہ "میں اب تھک گیا ہوں۔"

ان تیس برسوں میں اس نے امریکی صحافت میں اپنے لئے ایک لاثانی مقام پیدا کیا۔ یہ سچ ہے کہ اس نے خاصی دولت بھی کمائی تھی۔ لیکن ایک شخص کی کامیابی کا اندازہ صرف دولت سے ہی تو نہیں کیا جاتا۔ اس کے لئے اور بھی کئی پیمانے ہیں۔ مثال کے طور پر آیئے ہم دیکھیں کہ ایڈورڈ بوک نے خود اپنے لئے کیا خدمات انجام دیں۔

اس سلسلے کی پہلی کڑی یہ ہے کہ آج امریکہ کے لوگوں کو جو صاف ستھری اشیائے خوردنی ملتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایڈورڈ بوک نے خالص غذا کے قوانین کو رائج کرانے کے لئے بہت جدوجہد کی تھی۔ آج جس شہر میں ہم رہتے ہیں۔ وہ ماضی کی نسبت بہت صاف ستھرا ہے۔ اور اس کا سہرا بھی اس کے سر ہے۔ اس نے شہروں کو گندگیوں سے پاک کرنے کے لئے بڑی موثر مہم چلائی تھی۔ آج ہم جن گھروں میں رہتے ہیں۔ وہ زیادہ خوب صورت اور سجے ہوئے ہیں۔ کیونکہ اس نے وکٹوریہ کے زمانے کی کثافت اور غلاظت کے خلاف زبردست جہاد کیا تھا۔ اس زمانے میں گھروں کے ڈیزائن بہت ناپسندیدہ تھے۔ اور ان کی تعمیر پر خرچ بھی زیادہ آتا تھا۔ ایڈورڈ بوک وہ پہلا شخص تھا۔ جس نے امریکہ کے بہترین ماہر تعمیر کو ملازم رکھا تھا۔ اور اتنے مہنگے داموں گھروں کے ڈیزائن مہیا کرتے تھے۔ کہ لوگوں کو خریدنے میں کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ اور یہ کچھ اس نے اتنی کامیابی سے کیا کہ خود صدر تھیوڈور نے اس کے متعلق کہا تھا کہ "میرے نزدیک ایڈورڈ بوک وہ پہلا شخص ہے۔" جس نے پوری قوم کے فن تعمیر کو مثالی بنا دیا۔

رسالے کی ذمہ داریوں سے فارغ ہونے کے بعد اسے زندگی کے جو دس سال ملے۔ اس نے باغات لگانے میں صرف کر دیئے۔ اس نے اپنے آبائی وطن ہالینڈ سے پودوں کی ہزاروں قلمیں منگوائیں اور انہیں سڑکوں کے کنارے لگوا دیا۔ اس نے ریلوے اسٹیشن کو خوب صورت سبزہ زاروں میں تبدیل کر دیا۔

لیکن اس کی سب سے زیادہ مشہور اور شہرہ آفاق یادگار فلوریڈا میں شان دار ''گاتا ہوا مینار'' جو صحرا کسی زمانے میں ریت کے ٹیلوں سے بھرا پڑا تھا۔ آج سرسبز درختوں اور خوب صورت جھاڑیوں کا ذخیرہ ہے۔ اور ان کے اوپر ایک دو سو فٹ اونچا مینار ہے۔ جو سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ جس میں گھنٹیاں بجتی ہیں، اور جس کا عکس پائیں باغ کی جھیل میں دکھائی دیتا ہے۔



فلمی ستارے

فلورنز زیگ فیلڈ

اسے خوب صورت لڑکیوں کے نام، ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر سب سے زیادہ یاد تھے

بیس سال تک ''زیگ فیلڈ فولیز'' براڈوے کی سٹیج پر تماشائیوں کا محبوب بنا رہا۔ دنیا میں آج تک کسی کھیل یا تماشے نے نہ تو اتنی کامیابی حاصل کی تھی۔ کھیل سے نہ کبھی اتنا منافع ہوا تھا۔ اور نہ ہی کھیل میں اتنا روپیہ برباد کیا گیا تھا۔

فلورنز زیگ فیلڈ کو اتنی خوب صورت لڑکیوں کے ٹیلی فون نمبر زبانی یاد تھے کہ کسی اور کو نہیں ہو سکتے۔ اس کی ڈائری میں جسے اس نے خوب صورتی کی بیاض کا نام دے رکھا تھا۔ ہزاروں حسین و جمیل لڑکیوں کے نام، پتے اور ٹیلی فون نمبر درج تھے۔ اس کی تنقیدی نظروں کے سامنے ہر روز حسن کی پچاس ساٹھ دیویاں گزرتی تھیں۔

اسے اس بات پر بہت فخر تھا کہ اسے امریکی دوشیزاؤں کے حسن کو دوبالا کرنے کا والد کہا جاتا تھا۔ وہ سچ مچ اس لقب کا مستحق تھا۔ اکثر اس کی نگاہ انتخاب ایسی معمولی لڑکی پر پڑتی، جس کی طرف دوبارہ دیکھنے کی کوئی مرد زحمت بھی گوارا نہ کرتا تھا مگر وہ دیکھتے ہی دیکھتے اسے جاذبیت اور حسن کی شکل دے کر اسٹیج پر لے آتا تھا۔

زیگ فیلڈ کے سٹیج پہنچنے کے لئے جسمانی تناسب اور جاذبیت، دونوں چیزیں اتنی ہی ضروری تھیں، جتنی بیرون ملک جانے کے لئے پاسپورٹ کی۔ حسن کی شمع وہ

خود منور کر لیتا تھا۔ زیگ فیلڈ ایشیائی شہنشاہوں کی طرح فضول خرچ تھا۔ وہ کپڑے خریدنے پر بے انتہا روپیہ خرچ کرتا تھا۔ ہندوستان، یورپ اور ایشیا کا اچھے سے اچھا لباس خریدنے کے لئے بازار کے بازار چھان مارتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے لباسوں کے کنارے بھی بہترین ریشم کے بنے ہوتے تھے۔ کیونکہ اس کا دعویٰ تھا کہ کوئی عورت اس وقت تک اپنے آپ کو خوبصورت نہیں سمجھ سکتی جب تک اس نے خوب صورت لباس نہ پہن رکھا ہو۔

اپنے کھیل میں صرف گوالے لڑکوں کے لئے مناسب لباس نہ ملنے کی وجہ سے اس نے پورے تین ماہ کے لئے ''شوبوٹ'' کی نمائش ملتوی رکھی۔ پہلے شو پر اس نے 50,000 پونڈ صرف کیے۔ اور پھر محض اس وجہ سے نمائش بند کر دی کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ گوالے لڑکوں کا کردار ادا کرنے والوں کا نامناسب لباس پہننا زیگ فیلڈ کی روایت کے منافی تھا۔

اس کی ہر بات میں فضول خرچی کا پہلو نکلتا تھا۔ اگرچہ وہ ہر روز ہزاروں لوگوں سے ملتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی ان کے نام خط لکھانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اس کے دفتر سے تاریں اور خطوط اتنی بھاری تعداد میں باہر جاتے تھے کہ جیسے موسم خزاں میں درختوں کے پتے آندھی سے گر رہے ہوں۔ وہ جہاں جاتا تار کے فارم اس کے ہمراہ رہتے۔ وہ گرانڈ ریلوے اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوتا اور 125 ویں گلی میں پہنچنے سے پہلے پہلے تار کے فارموں کا پورا پیڈ ختم کر دیتا۔

یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ریہرسل کے وقت وہ آرکسٹرا کے احاطے میں

بیٹھتا اور قدی روشنیوں کی دوسری طرف کام کرنے والے اداکاروں کے نام تاریں بھیجتا رہتا۔ وہ ان لوگوں کے نام بھی تاریں بھیجتا تھا، جو اس سے اتنے کم فاصلے پر ہوتے کہ وہ انہیں باآسانی آواز دے کر بلا سکتا تھا۔ ایک بار اس نے اپنی کھڑکی سے باہر جھانک کر کھڑکی میں کھڑے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا، ''کیوں میاں'' میں نے تمہیں تار بھیجا تھا'' تم نے جواب کیوں نہیں دیا۔

اس کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ ٹیلی فون باکس کے قریب سے گزرے اور کوئی درجن بھر لوگوں کو ٹیلی فون کیے بغیر آگے بڑھ جائے۔ وہ ہر صبح اپنے عملے کے ارکان کو ٹیلی فون کرنے کے لئے چھ بجے اٹھ بیٹھتا تھا۔

وہ چار پانچ پونڈ بچانے کے لئے گھنٹوں منصوبے بناتا، اور اگلے روز وال اسٹریٹ میں □ 20, 000 پونڈ گنوا دیتا۔ اس نے ایک بار ایڈوین سے 1000 پونڈ ادھار لیا اور اس رقم سے امریکہ سے باہر جانے کے لئے پرائیویٹ ریل گاڑی کرائے پر لی۔

وہ عورتوں میں خوب صورتی کا احساس پیدا کرنے میں بلا کی مہارت رکھتا تھا۔ کسی ڈرامے کی افتتاحی رات کو کورس میں حصہ لینے والی ہر لڑکی کو اس کی طرف سے پھولوں کی ٹوکری کا عطیہ ملتا۔ وہ اپنے مشہور ترین اداکاروں کو اوسطاً 1000 پاونڈ معاوضہ دیتا تھا۔ عموماً ڈرامے کا موسم ختم ہونے پر ان کے پاس بینک میں اس کے مقابلے میں زیادہ رقم جمع ہوتی۔

جب اس نے سٹیج کا کاروبار شروع کیا، اس وقت کورس میں حصہ لینے والی

لڑکیوں کی اجرت چھ پاؤنڈ فی ہفتہ تھی۔ لیکن اس کے دور شاہنشاہی میں یہ اجرت بڑھ کر پچیس پونڈ فی ہفتہ ہو گئی۔

زیگ فیلڈ کو سٹیج کی طرف لانے والا واقعہ چودہ برس کی عمر میں رونما ہوا۔ گھر سے فرار ہو کر وہ "وائلڈ ویسٹ شو" میں کرتب دکھانے پر ملازم ہو گیا۔

پچیس برس کی عمر میں وہ "سینڈو نامی" ایک شعبدہ باز منیجر کی حیثیت سے خاصی دولت کمانے لگا۔ دو سال بعد وہ لندن میں تھا۔ وہ بالکل کنگال ہو چکا تھا۔ اس نے مونٹی کارلو کے جوئے خانے میں قسمت آزمائی کی اور وہاں اپنا آخری اثاثہ یعنی قمیض بھی گنوا بیٹھا۔

لیکن یہ عظیم سرمایا دار کنگال ہو کر بھی پریشان نہ ہوتا تھا۔ لندن میں بھی جب اسے شدید تنگ دستی کا سامنا تھا تو وہ حواس باختہ نہ ہوا۔ اس نے اس خستہ حالی میں بھی ایک کارنامہ انجام دیا۔ وہ یہ کہ یورپ کی کامیاب ترین اداکارہ، اینا ہالڈ کو اپنے ہمراہ امریکہ جانے پر رضامند کر لیا۔۔۔ اینا ہالڈ۔۔۔ جو لاکھوں کروڑوں تماشائیوں کی محبوب اور اپنے زمانے کی مے ویسٹ تھی۔

امریکہ کے بڑے بڑے پروڈیوسر کئی بار اینا ہالڈ سے درخواست کر چکے تھے کہ وہ نیویارک آئے۔ اسے بڑے بڑے معاوضے کا لالچ بھی دیا گیا۔ لیکن اسے امریکہ لانے کی سعادت صرف زیگ فیلڈ ہی کو نصیب ہوئی۔ فلورنز زیگ فیلڈ جس کی عمر بمشکل ستائیس برس تھی۔ جس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ جا بالکل غیر معروف تھا۔ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ فلورنز زیگ فیلڈ ایک روز چپکے سے اس کے

ڈریسنگ روم میں گیا۔ اسے متاثر کیا، معاہدے پر دستخط کروائے۔ اور اپنے لئے کامیابی کی راہیں ہموار کر لیں۔

اینا ہالڈ ایک قیامت تھی۔ اس نے پورے امریکہ میں تہلکہ مچا دیا۔ فیس پوڈر، ہیٹ، سینٹ، گھوڑوں، شرابوں اور سگرٹوں کے نام تک اس کے نام پر رکھے گئے۔ ایک ایک بندرگاہ پر اس کی صحت کے جام نوش کیے جاتے تھے۔ اور ذرا اندازہ کیجیے کہ صرف ایک سال کی دوستی کے بعد فلورنز زیگ فیلڈ نے اسے ازدواجی بندھن میں جکڑ لیا۔

کئی سال بعد وہ جب اینا کو طلاق دے چکا تھا۔ وہ بلی برکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ برکی سے پہلی ملاقات کے بعد ہی اس نے پھولوں کی ایک پوری دکان خریدی، اور تمام کے تمام پھول تحفتاً اسے بھجوا دیے۔ اور جب بلی برکی نے اسے بتایا کہ وہ ٹیلی فون پر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ لیکن چونکہ ٹیلی فون لائن مصروف تھی۔ اس لئے ایسا نہ کر سکی تو فلورنز زیگ فیلڈ نے بھی برکی کے لئے ایک خاص ٹیلی فون لگوا دیا۔ تاکہ اس سے دل کھول کر باتیں کر سکے۔

فلورنز زیگ فیلڈ کو کشمکش سے الفت تھی۔ وہ اس بات کے حق میں نہ تھا کہ کسی مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیا جائے۔ یا کسی معاملے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لیا جائے۔ وہ اپنی میز پر نشہ آور گولیوں کا ایک پیکٹ رکھتا تھا۔ اور جب ایک دوست نے سوال کیا کہ کیا یہ گولیاں اسے واقعی ہی اچھی لگتی ہیں۔ تو اس نے جواب دیا، لو سنو میں یہ گولیاں کیوں کھاتا ہوں۔ ان سب کا رنگ سیاہ ہے۔ اس لئے مجھے یہ فیصلہ کرنے

کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ مجھے کون سارنگ اچھا لگتا ہے یا برا؟۔

وہ اپنے تھیٹر کے لئے دنیا کے مشہور ترین مزاحیہ اداکاروں کی خدمات حاصل کرتا تھا۔لیکن اس کے باوجود وہ خود اور ال روجرز جیسے فن کار بھی اسے ہنسنے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔اس کا مزاج اس قدر سرد تھا کہ اداکار اسے "برف کا پانی" کہا کرتے تھے۔

اس کے مشہور کھیل "فولیز" کی پہلی رات جو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی تھی ۔اس کی یاد نیویارک کے لوگوں کے دلوں میں برسوں تک تازہ رہی تھی۔ہجوم کا یہ عالم تھا کہ سڑکوں سے گزرنا مشکل تھا۔اور پہلی صف کی نشست کی ایک ایک ٹکٹ تیس پونڈ تھی۔سٹیج کے پیچھے بھی کم ہنگامہ نہ تھا۔پردہ کھینچنے والی لڑکیاں اور پیغام بر ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔مزاحیہ اداکار سٹیج پر جانے سے پہلے بار بار اپنے کام کی ریہرسل کر رہے تھے۔کورس میں شریک ہونے والی لڑکیاں بار بار اپنا میک اپ ٹھیک کر رہی تھیں۔اور اس ہنگامہ میں صرف ایک شخص پرسکون تھا اور وہ تھا فلورنز زیگ فیلڈ۔نیویارک کے باذوق تماشائی قیمتی سے قیمتی اور خوب صورت سے خوب صورت لباس پہن کر کھیل دیکھنے آئے تھے۔لیکن فلورنز زیگ فیلڈ نے بالکل سادہ لباس پہن رکھا تھا۔اور تو اور اس نے کرسی پر بیٹھنا بھی مناسب خیال نہ کیا۔اور گیلری کی سیڑھی پر کھڑا کھیل دیکھتا رہا۔

1929ء میں وال سٹریٹ کے مالی بحران کے ساتھ ہی فلورنز زیگ فیلڈ کی زندگی کے ڈرامے کا اختتام قریب آ گیا۔اس کے بعد اس عظیم جادوگر میں، جس نے

سٹیج پر حسن اور خوب صورتی کے فتنے جگائے تھے۔ اتنی سکت باقی نہ رہی کہ وہ کرایہ تک ادا کر سکے۔ آخری بار "فولیز" پیش کرنے کے لئے اس کے اپنے اداکاروں اور ملازمین نے چندہ جمع کیا تھا۔

فلورنز زیگ فیلڈ کا انتقال 1932ء میں کیلیفورنیا میں ہوا۔ موت سے ہم آغوش ہوتے وقت وہ سمجھ رہا تھا کہ کسی کھیل کی ہدایت کاری کر رہا ہے۔ اس کا سٹیج ہسپتال کا ایک کمرہ اور اس کا آرکسٹرا وائرلیس سیٹ تھا۔ اس کے ہونٹ خشک تھے۔ اور آنکھیں بخار سے جل رہی تھیں۔ لیکن وہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے غیر مرئی اداکاروں کو ہدایات دینے لگا۔

"پردہ گرایئے" وہ چلایا "موسیقی تیز" "خوب کھیل کامیاب ہے۔ کھیل،،،، کا،،، کامیاب ہے"۔



لائنل بیری مور

26 برس کی عمر میں وہ ایک نامور ایکٹر تھا۔ □ 53 برس کی عمر میں وہ گوشہ گم نامی میں پڑا تھا اور 57 برس کی عمر میں وہ ایک عظیم ایکٹر بن چکا تھا۔

1918ء کی جس رات کو لائنل بیری مور نے براڈوے میں ''دی کوپر ہیڈ'' نامی ڈرامے میں ملٹ شیکلنس کا کردار ادا کیا۔ اس رات میں بھی اس تھیٹر میں موجود تھا۔ یہ ایک یادگار رات تھی۔ اس ڈرامے نے لاثانی شہرت حاصل کی۔ اور تماشائیوں نے اسے اتنا پسند کیا کہ وہ اپنے پیروں کے پنجوں پر کھڑے ہو کر انتہائی جوش وخروش سے تالیاں بجاتے رہے۔ اور بار بار یہ مطالبہ کرتے رہے کہ اداکاروں کو۔۔۔۔ خاص کر لائنل بیری مور کو سٹیج پر بلایا جائے۔ اس مسلسل مطالبے پر تھیٹر والوں کو پندرہ بار پردہ اٹھانا پڑا۔

پندرہ برس بعد براڈوے میں گولڈون میئر کے مرکزی دفتر میں مجھے لائنل بیری مور سے کئی گھنٹے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ جب اس نے مجھے تفصیل بتائی کہ اسے اپنے آپ کو ایک کامیاب اداکار تسلیم کرانے کے لئے کس قدر جدوجہد کرنا پڑی۔ تو مجھے تعجب ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا تم بھی کمال کرتے ہو۔ بیری مور

جیسے اونچے اور مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہوئے تمہیں جدوجہد کرنا پڑے؟۔اس نے لمحہ بھر میری طرف دیکھا اور پھر مدھم آواز میں کہنے لگا۔اونچا اور مشہور خاندان۔ ہوں خاندانی شہرت تو بعض اوقات اچھی خاصی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

دراصل بیری مور خاندان کے بچوں کی زندگی بہت عجیب وغریب طریقے سے گزرتی تھی۔ان کا باپ مورس بیری مور بڑی دل کش شخصیت کا مالک تھا۔اور اس کے شوق بھی بہت عجیب تھے۔

وہ اپنی جیب کی آخری پائی بھی جانور خریدنے پر صرف کر دیتا تھا۔وہ بحری جہازوں میں ریچھ، بندر اور جنگلی بلیاں لاد لاد کر گھر لایا کرتا تھا۔جان اور لائنل نے ایک شام جزیرہ سٹیٹن پر گزاری۔ان کے پاس ایک بوڑھے نوکر اور پینتیس کتوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

جب لائنل جیک اور اتھل بیری مور نے "راسپوٹین" اور "ایمپریس" میں کام کیا تو ہالی وڈ نے انتہائی فخر کے ساتھ اعلان کیا کہ پہلی بار ان تینوں نے ایک ساتھ ایک فلم میں کام کیا۔لیکن ہالی وڈ کا یہ اعلان صحیح نہیں تھا۔بیری مور خاندان کے یہ تینوں نوجوان اس سے کوئی چالیس سال پہلے ایک ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے تھے۔اداکاری کا یہ مظاہرہ جزیرہ سٹیٹن میں ایک ایکٹر کے مکان کے پچھواڑے میں ایک ٹوٹے پھوٹے چبوترے پر کیا گیا۔تماشائی کون تھے؟۔گلی محلے کے چھوٹے چھوٹے بچے۔ٹکٹ کی قیمت صرف ایک پائی تھی۔اور اس شو سے جو آمدنی ہوئی تھی۔ وہ صرف ایک شلنگ اور تین پنس سے زیادہ نہ تھی۔انہوں نے کیمیلی ڈرامہ کیا تھا۔

اتھل اس ڈرامے کا بزنس مینجر تھا۔ اس نے معاوضے کے طور پر لائنل اور جیک کو پانچ پانچ پنس ادا کیے۔ اور ان کی برہمی کی کوئی پرواہ کیے بغیر باقی آٹھ پنس اپنی جیب میں ڈال لیے۔

لائنل اور جیک دونوں میں سے ایک کی بھی خواہش نہ تھی کہ وہ اداکار بنیں۔ دونوں آرٹسٹ بننا چاہتے تھے۔ اور لائنل نے تو کچھ عرصہ تک پیرس میں تعلیم بھی حاصل کی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے خالی جیب اور بھوکا بھی رہنا پڑا۔ اس نے جواب دیا، کئی بار۔ کیونکہ رسالوں والے میری بنائی ہوئی تصویریں خریدنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ میں ہر وقت تار دے کر گھر سے پیسے منگوا سکتا تھا۔ اور اکثر منگواتا بھی رہتا تھا۔ لیکن اکثر اوقات میرے پاس تار دینے کے لئے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے۔ جیک نے اور میں نے مل کر گاؤں میں ایک سٹوڈیو بھی کھول رکھا تھا۔ لیکن ہمارے پاس فرنیچر کے لئے کوئی پیسہ نہ تھا۔ ہمارے پاس چارپائی تک نہ تھی۔ اس لئے ہم دونوں زمین پر ہی سوتے تھے۔ اور جب سردی زیادہ ہو جایا کرتی تھی تو ہم اپنے آپ کو رسالوں اور کتابوں سے ڈھانپا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ ہمارا ایک اور دوست بھی رہا کرتا تھا۔ وہ ادیب تھا اور ہماری طرح کنگال۔ اس کے ایک دانت پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا۔ جو اتارا بھی جا سکتا تھا۔ جب ہماری جیب بالکل خالی ہو جاتی تو ہم اس خول کو گروی رکھ کر تھوڑے بہت پیسے لے لیتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ ہم تمام دکانیں چھانا کرتے تھے۔ لیکن ہمیں اس سونے کے

عوض کبھی تین شیلنگ سے زیادہ کبھی نہیں ملے تھے۔

چھبیس سال کی عمر میں لائنل بیری مور مشہور اداکار بن چکا تھا۔ اس کا نام براڈوے کے تمام اشتہاری بورڈوں پر جلی حروف میں دکھائی دیتا تھا۔ لیکن ترپن (53) برس کی عمر میں اس کا نام صرف ایک بھولی بسری کہانی بن کر رہ گیا تھا۔ البتہ اس کا نوجوان بھائی مشہور ترین اداکاروں میں سے ایک تھا۔ اور اپنے کام کے عوض بہت پیسہ لیتا تھا۔ اس کی بہن ایتھل نیویارک تھیٹر کی مالکن تھی۔ اور خود لائنل بیری مور ہالی وڈ میں ایک ڈائریکٹر کی حثیت سے کس مپرسی کے دن گزار رہا تھا۔

اس کے دوستوں اور رشتہ داروں کو اس بات کا بہت صدمہ تھا۔ وہ ہمیشہ یہ شکایت کرتے تھے کہ امریکہ کا سب سے اونچا اداکار گم نامی کے دن گزار رہا ہے۔ لیکن خود لائنل بیری مور نے کبھی اس کی شکایت نہیں کی تھی۔

اس نے تیئس (23) سال تک سٹیج سے جو تجربہ حاصل کیا تھا۔ اسے فلموں کی ہدایت کاری کی نذر کر دیا۔ وہ ہر وقت سوچتا یا پڑھتا رہتا تھا۔ اس نے نئے تجربے کیے، وہ پہلا ہدایت کار تھا۔ جس نے یہ دریافت کیا کہ ساؤنڈ کیمروں کو ادھر ادھر گھمایا جا سکتا ہے۔ یہ دریافت بولتی فلموں کی تاریخ میں ایک عظیم الشان انقلاب ثابت ہوئی۔ اس نے کئی ناقابل فراموش فلمیں بنا کر ناخداؤں کو حیرت میں ڈال دیا۔ ان میں رتھ چیٹر کن کی "میڈم لارنس ٹبٹ" کی "دی روج سانگ" اور باربرہ سٹینون وک کی "ٹین سینٹ اے ڈانس" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اب اس کی عمر ترپن برس ہو چکی تھی۔ اور اسے پوری ایمان داری سے یقین ہو چکا تھا کہ اس کی ادا

کاری کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔

جب وہ اداکاری چھوڑ کر ہدایت کاری کی طرف متوجہ ہوا تو اس پر کامیابی کے دروازے کھل گئے۔ ان دنوں نارما شیرر ''اے فری سول'' نامی فلم بنا رہا تھا۔ باپ کے ایک مرکزی کردار کے لئے ایک بہت بڑے اداکار کی ضرورت تھی۔ لائنل بیری مور اس روپ میں کیمرے کے سامنے آیا، اور شہرت کے ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔

اس نے موشن پکچر آرٹس اور سائنس اکیڈمی سے انعام حاصل کیا۔ اس کے بعد وہی فلم ساز جو اسے گزرا ہوا دور سمجھ چکے تھے۔ اسے اپنی فلموں میں کام دینے کے لئے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے۔ اس کے بعد اس کی ہر فلم بے حد کامیاب ہوئی۔ ان میں سے ''دی بے لو کلٹ'' ''ماتا ہری'' اور ''گرینڈ ہوٹل'' ''راسپوٹین اینڈ دی ایمپریس'' اور ''آہ وائلڈرنس'' آج بھی دنیا کو یاد ہیں۔

میں نے لائنل بیری مور سے پوچھا کہ دوبارہ کامیابی کے راستے پر گام زن ہونے سے پہلے کیا وہ کبھی دل برداشتہ بھی ہوا تھا؟۔ اس نے جواب دیا نہیں میں نے زندگی میں کبھی حوصلہ نہیں چھوڑا۔ زندگی میں کئی نشیب و فراز آتے رہے ہیں۔ مجھے اپنے کام اور اپنی جستجو سے کبھی اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ اپنی پریشانی کا ماتم کر سکوں۔

جان کرافورڈ

ہم جماعت لڑکیاں اسے اپنے پرانے کپڑے پہننے کے لئے دیا کرتی تھیں

آج سے کوئی بارہ برس پہلے، میسوری میں کالج کی ایک کم عمر طالبہ رات کو تکیے میں منہ چھپا چھپا کر رویا کرتی تھی۔ اس کے رونے کی وجہ تنہائی کا احساس تھا۔ لیکن آج جب وہ گھر سے نکلتی ہے تو اسے دیکھنے کے لئے لوگوں کا ہجوم لگ جاتا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے ملکوں کے کروڑوں باشندے اس کے نام اور اس کی صورت سے آشنا ہیں۔

آج سے بارہ سال پہلے یہ لڑکی سٹیفنز کالج میں اپنی پڑھائی اور رہائش کے اخراجات ادا کرنے کے لئے پریشان رہا کرتی تھی۔ اور وہ اس قدر غریب تھی کہ اسے وقتاً فوقتاً اپنے کالج کے اخراجات ادا کرنے کے لئے اس کی ہم جماعت چوکیدار سے ادھار لینا پڑتا تھا۔ اگر اسے کوئی دعوت ملتی تو وہ اس میں شریک نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے پاس پہننے کے لئے

اچھے کپڑے نہ ہوتے تھے۔ اس کی ہم جماعت لڑکیاں اسے پرانے کپڑے پہننے کے لئے دیا کرتی تھیں۔ آج ہالی وڈ میں وہ غالباً سب سے زیادہ خوش لباس خاتون ہے۔ اور دنیا کے بہت سے ملکوں کی خواتین اس کے لباس کی نقل کرتی ہیں۔

بڑے بڑے درزی اس سے التجائیں کرتے ہیں۔ کہ وہ ان کا سلا ہوا لباس پہن کر تقریبوں میں جائے۔ تاکہ اس بہانے ان کی قسمت بھی جاگ اٹھے۔

یہ تنہا، غمزدہ اور بدنصیب لڑکی کون تھی؟۔ جو اس قدر نادار تھی کہ اپنے لئے نیا لباس بھی نہ خرید سکتی تھی۔ اس کا نام لوسیلی لی سویرا تھا۔ کیا آپ نے یہ نام کبھی نہیں سنا؟۔ دراصل یہ اس کا اصلی نام ہے۔ لیکن فلمی دنیا میں وہ جان کرافورڈ کے نام سے مشہور تھی۔

جان کرافورڈ اب ایک مال دار خاتون ہے۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کسی اجنبی شہر میں اگر کوئی شخص کنگال ہو جائے تو اس پر کیا گزرتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ جب انسان بھوک سے نڈھال ہو رہا ہو، اور اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ ہو تو اسے کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے خبر ہے کہ جب منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے آدمی کو قدم قدم پر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے تو اس پر کیا گزرتی ہے۔ اور وہ کس قدر دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔ جان کرافورڈ کا بچپن لاٹن اوکلاہوما میں گزرا۔ جہاں وہ اپنا اکثر وقت لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں گزارتی تھی۔ اس کا سب سے پسندیدہ کھیل اداکاری تھا۔ وہ اور اس کے ساتھ لکڑی کی پرانی پیٹیاں لے کر ان کے سٹیج بناتے۔ اس کے بعد لالٹین سے قدری روشنیوں کا کام لیا جاتا، یہیں سے جان کرافورڈ نے اپنے فن کی ابتداء کی۔ اس نے اسی وقت مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ایکٹرس بنے گی۔ اور اچھے سے اچھا لباس پہنے گی۔ اس نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ جب وہ بڑی ہو جائے گی تو سرخ مخمل کا ایسا گاؤن زیب تن کرے گی کہ جس پر سونے کے

بٹن لگے ہوئے ہوں۔ اور سر پر ایسا ہیٹ پہنے گی، جو انتہائی قیمتی ہو۔ جس میں خوب صورت پر مزین کیے گئے ہوں۔

جن جان آٹھ سال کی ہوئی تو اس کی ماں کیناس شہر چلی آئی۔ اور اس نے جان کو کانوینٹ سکول میں داخل کرا دیا۔ یہاں جان کو اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اب لڑکوں کے ساتھ کھیل کود کا زمانہ ختم ہو گیا تھا۔ لکڑی کے ڈبوں پر اداکاری کا مظاہرہ قصہ ماضی بن چکا تھا۔ ہوسٹل میں رہائش کے عوض اسے چودہ کمروں کی صفائی کرنا پڑتی۔ پچیس بچوں کے لئے کھانا پکانا پڑتا تھا۔ اور برتن مانجھنے پڑتے تھے۔ ان بچوں کو نہلانے دھلانے کا کام بھی اس کے سپرد تھا۔

چھ سال بعد اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے کولمبیا میسوری کے سٹیفنز کالج میں داخلہ لے لیا۔ پیسہ کہاں سے آیا۔ اس کے پاس کوئی پیسہ نہ تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، وہ اپنی ہم جولیوں کے پرانے کپڑے پہنتی، اور اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے باورچن کے طور پر کام کرتی۔ وہ لڑکیاں جو ان دنوں اس کو غریبی کی وجہ سے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ آج ٹھنڈی آہ بھر کر کہتیں۔ ''جان کرافورڈ'' ہاں ہاں میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ ہم تو کالج بھی ساتھ ساتھ جاتی تھیں۔

سٹیفنز کالج اب اس پر فخر محسوس کرتا تھا۔ اور کھانے کے کمرے میں اس کی ایک بہت بڑی تصویر آویزاں تھی۔ جس کے نیچے لکھا ہوا ہے۔ جان کرافورڈ اس کمرے میں لڑکیوں کو کھانا کھلایا کرتی تھی۔

اس وقت جان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ رقاصہ بنے۔ چنانچہ جب اسے ایک معمولی سے تھیٹر میں چار پونڈ فی ہفتہ اجرت پر رقاصہ کی حیثیت سے کام کرنے کی پیش کش ہوئی تو وہ خوشی کے مارے پاگل ہوگئی۔ صرف دو ہفتے بعد تھیٹر بند ہو گیا۔ تھیٹر کی مالی حالت یہ تھی کہ مالک کے پاس فن کاروں کی اجرت تک ادا کرنے کے لئے پیسے نہ تھے۔ یوں اسے خالی جیب اجنبی شہر میں مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

کیا اس ناکامی کے بعد اس کی خواہش نے دم توڑ دیا؟۔ ہرگز نہیں، اس نے کچھ رقم ادھار لی۔ وہ واپس کینساس شہر پہنچی۔ ملازمت کر کے کچھ روپیہ پس انداز کیا اور ایک صبح گاڑی میں بیٹھ کر شکاگو روانہ ہوگئی۔ ٹکٹ خریدنے کے بعد اس کے پاس صرف دس شلنگ بچے تھے۔ وہ یہ رقم خرچ نہ کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے دونوں وقت کھانا نہ کھایا۔

اسے ایک ہوٹل میں رقاصہ کے طور پر رکھ لیا گیا۔ بعد میں وہ نیویارک چلی آئی۔ اور ونٹر گارڈن میں ایک کورس گرل کی حیثیت سے رقص کرتی رہی۔ مشہور فلم کمپنی ایم، جی ایم کے نمائندے نے اسے یہاں رقص کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس لڑکی میں جاذبیت بھی ہے۔ اور یہ رقص بھی خوب کرتی ہے۔ اس نے جان کو مشورہ دیا کہ وہ سکرین ٹیسٹ دے۔

کیا کہا"فلم۔ قطعی نہیں" اس نے جواب دیا۔ وہ تو سٹیج کی مشہور ترین رقاصہ بننے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد وہ سکرین ٹیسٹ دینے پر رضا

متند ہوگئی۔ اسے ہالی وڈ کے ریلوے ٹکٹ کے علاوہ پندرہ پاونڈ کا معاہدہ دیا گیا۔ ہالی وڈ والوں نے اس کا نام سن کر بہت ناک بھوں چڑھائی۔ ''لوسیلی لی سویر؟''۔ نام شاعرانہ ضرور ہے۔ لیکن فلم ایکٹرس کے لئے بالکل نہیں جچتا۔ کوئی بھلا مانس نہ تو یہ نام یاد رکھ سکتا ہے۔ اور نہ اس کے ہجے کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایک فلمی رسالے نے اس کے لئے مناسب نام منتخب کرنے کے لئے ایک انعامی مقابلہ کرایا۔ رسالے کے قارئین نے ہزاروں نام تجویز کیے۔ آخر کار جان کرافورڈ'' کے حق میں فیصلہ ہوا۔ لیکن ابھی تک وہ کامیاب اداکارہ نہ بن سکی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے کردار ادا کرتی اور رات کو رقص کے لئے ضرور وقت نکالتی۔ اس طرح وہ چارلسٹن، بلیک باٹم اور سینٹ لوئیس ہوپ نامی ہوٹلوں میں اپنے رقص کا مظاہرہ کرتی رہی۔ اس نے رقص کے مقابلوں میں جوتوں کے کئی کئی جوڑے توڑنے اور اپنے عقیدت مندوں سے بار بار خراج تحسین وصول کیا۔

لیکن اس وقت وہ جان کرافورڈ نہیں تھی۔ جو آج ہے۔ اس وقت وہ کسی قدر دہرے جسم میں چھوٹی سی لڑکی تھی۔ جس کے بال بہت گھنے تھے، اور جو اپنے شرمیلے پن کو چھپانے کے لئے آداب کو بھی نظر انداز کر دیتی تھی۔ پھر ایک روز اسے احساس ہوا کہ اگر اسے ہالی وڈ میں رہنا ہے تو اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ رات ہی رات میں کامیابی کی خواہش نے اس کا ذہن تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد اس نے کسی ہوٹل میں رقص نہیں کیا۔

اس نے پوری دل جمعی اور سنجیدگی سے فرانسیسی اور انگریزی کے علاوہ گانا سیکھنا

شروع کیا۔ اپنا وزن کم کرنے کے لئے اس نے تین سال مسلسل فاقے کیے۔ اب بھی اس کے ناشتے میں شربت کے ایک گلاس کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ کبھی کبھی تو وہ دودھ کے ایک گلاس کے سوا دن بھر کچھ نہ کھاتی۔ اس نے خوب دل لگا کر محنت کی، اور اس طرح اسے فلموں میں اچھے کردار ملنے لگے۔ ایک فلم میں ایک افریقی رقص کرتے ہوئے وہ اتنی محو ہوگئی کہ اس نے اپنا ایک ٹخنہ زخمی کر لیا۔ لیکن اس نے کام ادھورا نہ چھوڑا۔ زخم پر پٹی باندھی اور دوبارہ ناچنا شروع کر دیا۔

جان کرافورڈ خود کہتی ہے کہ اسے خود حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیا بن گئی ہے۔ اس نے ایک غریب گھرانے میں جنم لیا تھا۔ اب دولت اس کی لونڈی ہے۔

اس کی خاندانی حیثیت کچھ بھی نہیں، لیکن وہ جہاں بھی جاتی ہے۔ اس کے گرد و پیش عقیدت مندوں کا ہجوم لگ جاتا ہے۔ وہ پیدائش کے وقت خوبصورت نہ تھی۔ مگر اب وہ خوب صورت ترین ایکٹرسوں میں سے ایک ہے۔



چک بیل

وہ سولہ برس تک ایک ہی جوتا پہنتا رہا

دنیا کی تاریخ میں فقط ایک مصنف ایسا ہے۔ جس نے ایک ایسی کتاب لکھی کہ اس کے ہر لفظ پر دس پونڈ نفع کمایا۔ اس کتاب کا نام "دی سپیشلسٹ ہے۔" اور مصنف کا نام ہے چک بیل۔

"دی سپیشلسٹ" چک بیل کی پہلی کتاب تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ کتاب بالکل فروخت نہ ہوگی۔ اس لئے اس نے فقط دو ہزار جلدیں شائع کرائیں۔ اور یہ جلدیں چھ ہفتوں میں فروخت ہوئیں۔ پھر اچانک کتاب کی شہرت جنگل کی آگ کی طرح سارے امریکہ میں پھیل گئی۔ اور یہ کتاب "دی گڈ ارتھ" سے بھی زیادہ فروخت ہوئی۔ تو کیا آپ کو اپنے آپ پر اور اس کتاب پر فخر نہ ہوگا۔ لیکن چک بیل کو اپنی اس تصنیف پر کوئی فخر نہ تھا۔ بلکہ اس کے برعکس اس کو "دی سپیشلسٹ" لکھنے پر افسوس ہوا۔ کیونکہ لوگوں کی زیادہ تعداد اس کتاب کا مزاح سمجھنے سے قاصر رہی۔ اور بہتوں نے اس کی غلط تشریح کی تھی۔

لیکن اس کتاب نے جو کامیابی حاصل کی۔ اس پر چک بیل کو بڑا فخر تھا۔ جب اس کی موجودگی میں لوگ اس کتاب کا ذکر کرتے تو وہ گھبرا سا جاتا تھا۔ اور اسکی کوشش ہوتی کہ اس کے سامنے کوئی اس کا ذکر نہ کرے۔ خصوصاً جب کوئی اس

کتاب کے مزاح کو سوقیانہ قرار دیتا۔ ایک دفعہ اس کی لڑکی کتاب پڑھ کر رونے لگی، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس کتاب نے ان کے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی تھی۔

چک سیل محض اتفاقیہ طور پر مصنف بن گیا۔ حقیقت میں وہ ایکٹر تھا۔ ایک بہترین کریکٹر ایکٹر۔

لیکن وہ ایکٹر بھی کم وبیش اتفاقیہ طور پر بنا تھا۔ کئی برس پہلے وہ اربانہ میں ریلوے ورکشاپ میں کام کیا کرتا تھا۔ اس کی بڑی بہن تھیٹر کی ایکٹرس بننا چاہتی تھی۔ لہذا وہ شکاگو جا کر وہاں ایک ڈرامیٹک سکول میں داخل ہوگئی۔ جب کرسمس کی چھٹیوں میں وہ گھر آئی تو اس نے ایک چرچ میں منعقد ہونے والے چیریٹی شو میں ایک دہقان کا مزاحیہ رول ادا کیا۔

جب وہ کردار انجام دے کر واپس آئی تو چک سیل نے کہا۔ یہ کوئی بڑی بات ہے، میں کسی ڈرامائی تربیت کے بغیر ایسا کر سکتا ہوں۔

اس کی بہن نے اسے سٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ اس نے سٹیج پر چڑھ کر ایک مقامی ٹیلی فون آپریٹر کی نقلیں اتارنا شروع کر دیں۔ ہنسی کے مارے لوگوں کی بری حالت ہوگئی اور وہ کرسیوں سے نیچے گرنے لگے۔

اگلے ہفتے اربانہ میں ایک گشتی تھیٹر آیا۔ ان کے پاس ایک مزاحیہ ایکٹر تھا۔ جو مختلف مناظر کے بعد سٹیج پر آ کر لوگوں کو ہنساتا رہتا تھا۔ لیکن اتفاق سے وہ بیمار پڑ گیا۔ جب چک سیل کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس کام کے لئے اس نے تھیٹر کے مینجر کو

درخواست دے دی۔

مینجر کو اس سلسلے میں اس کی صلاحیت پر شک تھا۔ لیکن جب چپ لین نے بطور نمونہ اسے اپنی اداکاری دکھائی اور مینجر نے اسے پچاس شلنگ فی ہفتہ پر ملازم رکھ لیا۔ اس اتفاق نے چپ لین کی زندگی بدل دی۔

تھیٹر کی رنگارنگ روشنیاں، پانچ سو تماشائیوں کی تالیاں اور قہقہے یہ سب چیزیں چپ لین کے دل میں گھر کر گئیں۔ اب ریلوے ورکشاپ جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

اس نے اپنا سوٹ کیس سنبھالا اور کسی تھیٹر میں ملازمت کرنے کے لئے شکاگو کی سمت چل پڑا۔ اس نے ایک سستے بورڈنگ ہاؤس میں رہائش اختیار کر لی۔ اور اپنی اداکاری کی مشق کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ مونچھیں لگانے سے وہ قدرے بوڑھا دکھائی دینے لگے گا۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ مونچھیں کہاں فروخت ہوتی ہیں۔ لہذا اس نے ایک اونی چٹائی سے کچھ سخت بال نکالے اور ان سے مونچھوں کا ایک جوڑا بنا لیا۔ وہ آٹھ ماہ تک سٹیج پر یہی مونچھیں استعمال کرتا رہا۔ آخر اس نے بازار سے مونچھیں خرید لیں۔

شروع میں اسکی تنخواہ بہت کم تھی۔ اور اس کے لئے ہر پیسہ بڑا قیمتی تھا۔ خود کو زیادہ کھانے کی ترغیب سے بچانے کے لئے وہ کھانا کھانے سے پہلے سستی قسم کی مٹھائی وغیرہ کھا لیتا۔ تاکہ اس کی بھوک کم ہو جائے اور وہ کھانے کے پیسے بچا سکے۔

ایسی اشیاء کھانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس کا معدہ خراب ہو گیا۔ بعد میں اسے پیٹ

کے مختلف آپریشنوں پر ہزاروں پونڈ خرچ کرنے پڑے۔ پھر وہ جہاں کہیں جاتا اپنا خانساماں اپنے ہمراہ رکھتا۔ ہوٹل کے کھانے سے اسے نفرت ہوگئی تھی۔ وہ اپنے ہمراہ ایک سوٹ کیس بھی لے جایا کرتا تھا۔ جو ہزاروں لطیفوں سے بھرا ہوتا تھا۔ اس کے پاس لطیفوں کا ایک وسیع ذخیرہ تھا۔ لیکن ذاتی قسم کی گفتگو کے دوران اس نے کبھی کوئی لطیفہ یا مزاحیہ بات نہ سنائی تھی۔

اس نے براڈوے میں چھ میوزیکل مزاحیہ کھیلوں میں حصہ لیا۔ لیکن وہ بذات خود نہ تو گا ہی سکتا تھا۔ اور نہ ناچ سکتا تھا۔ اس نے پیرس کی زندگی سے متعلق کئی ڈراموں میں کام کر کے ہزاروں پونڈ کمائے تھے۔ لیکن وہ کبھی پیرس نہ گیا تھا۔

وہ جوتوں کا ایک ہی جوڑا سولہ برس تک پہنتا رہا۔ یہ جوڑا وہی تھا، جو اس نے کرسمس کے موقع پر ٹیلی فون آپریٹر کی نقلیں اتارتے وقت پہن لیا تھا۔ اس کا اعتقاد تھا کہ جوتوں کے اس جوڑے نے اس کی قسمت بدلی تھی۔ لہذا وہ مسلسل ان کی مرمت کراتا رہتا۔ اور کوئی دوسرا جوتا پہننے سے انکار کر دیتا۔

ورائٹی پروگرام میں کام کرنے کے دوران اسے ایک خوب صورت لڑکی سے محبت ہوگئی۔ تھیٹر میں ہزاروں لوگوں کا سامنا کرتے وقت وہ بالکل نہ گھبراتا۔ لیکن اس لڑکی کو شادی کا پیغام دیتے وقت اس کی زبان لڑکھڑانے لگی اور وہ شرمانے لگا۔ اس کی حالت بےحد غیر ہونےلگی تھی۔ اور وہ طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے اسے ٹیلی فون پر شادی کا پیغام دیا۔ جسے اس لڑکی

نے قبول کر لیا۔ ان کی شادی ہو گئی، ان کے یہاں چار بچے پیدا ہوئے۔

"وی سپیشلسٹ" سے لاکھوں پونڈ کمانے کے بعد چک سیل نے ایک دوسری مزاحیہ کتاب لکھی۔ لیکن یہ کتاب بری طرح ناکام ہوئی اور اس کی اتنی جلدیں بھی فروخت نہ ہوئیں کہ وہ اس کتاب کی چھپائی کے اخراجات پریس کو ادا کر سکے۔

☆☆☆

میری پک فورڈ

اس کے پاس مالی امداد کی درخواستیں اس کی آمدنی سے دس گنا زیادہ آتی تھیں۔

دنیا کی نامور ترین خاتون کون تھی؟۔ یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ لیکن میرے خیال کے مطابق یہ اعزا ایک کینیڈین لڑکی کو حاصل ہے۔ جس کا مسیحی نام گلیڈ یز میری سمتھ تھا۔ اور جس کا وزن ایک سو پونڈ سے زیادہ نہیں تھا۔

مس سمتھ نے بہت ہی چھوٹی عمر میں سٹیج پر نمودار ہونا شروع کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے ڈیوڈ بلسکو جیسا ماہر فن استاد مل گیا۔ اس نے سب سے پہلے گلیڈی سمتھ بہت غیر رومانی نام بدل کر اس کا نام میری پک فورڈ رکھا۔ بلسکو کی تربیت نے میری پک فورڈ کی زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا۔

میری پک فورڈ اس وقت فلمی افق پر روشن ستارہ بن کر چمک رہی تھی۔ جب کہ گریٹا گاربو ابھی ایک حجام کی دکان میں چمڑے کے فیتے پر استرے تیز کیا کرتی تھی۔ فلمی دنیا میں وہ سب سے زیادہ پرانی اداکارہ ہے۔ جس زمانے میں ابھی چارلی چپلن نے ابھی ہالی وڈ کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ وہ فلموں میں کام کرنے کا معاوضہ سب سے زیادہ لیا کرتی تھی۔

میری پک فورڈ نے اس زمانے سے اپنی روزی خود کمانی شروع کر دی تھی۔

جب کہ کارخانے والے اسے اس ڈر سے ملازم نہیں رکھتے تھے کہ کہیں اتنے کم عمر بچے کو ملازم رکھنے پر ان کا چالان نہ ہو جائے۔

نیو یارک کی گیری سوسائٹی جیسی تنظیموں نے بھی اس کی کم عمر کے پیش نظر اسے کئی بار سٹیج پر کام کرنے سے روکا۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ اسٹیج پر کام کرنے کی بجائے ابھی تو اسے دو اور دو چار سیکھنا چاہیے۔ لیکن میری پک فورڈ نے بھی انہیں خوب بیوقوف بنایا۔ اس کی چچیری بہن اس سے عمر میں ایک سال بڑی تھی۔ میری پک فورڈ اس کا سرٹیفکیٹ استعمال کر کے قانون کی نظر سے بچ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ کون شخص گیا ہے' اور دوسری ڈائریکٹروں میں اس کی عمر اس کی اصلی عمر سے ایک سال بڑی لکھی جاتی ہے۔

میری پک فورڈ کا دادا ۸، اپریل کو پیدا ہوا تھا۔ اور 1894ء کو جو میری پک فورڈ کا پیدائش کا سال ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی آٹھ اپریل کو پیدا ہوئی ہوگی۔ لوگوں میں بھی یہ مشہور ہو گیا تھا کہ میری پک فورڈ خاندان نے آٹھ اپریل کا دن بچوں کی پیدائش کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ میری پک فورڈ کی والدہ بھی اپنی ساس کے نقش قدم پر چلنا چاہتی تھی۔ اور آٹھ، اپریل کو اپنے شوہر کی سالگرہ پر اسے ایک بچے کا تحفہ دینا چاہتی تھی۔ لیکن جب ننھی میری وقت مقررہ پر تشریف نہ لا سکی تو سب کو مایوسی ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ میری پک فورڈ نو، اپریل رات تین بجے پیدا ہوئی۔ لیکن تاریخ اور وقت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے گھر والوں نے اس کا یوم ولادت آٹھ

اپریل ہی کو ظاہر کیا۔پچیس برس تک یعنی جب تک اس کی والدہ زندہ رہی اس نے یہ بھرم قائم رکھا۔اور میری کی سال گرہ بڑی باقاعدگی سے 8 اپریل ہی کو منائی جاتی رہی ۔لیکن اپنی والدہ کی وفات کے بعد میری پک فورڈ نے اب اپنی سال گرہ 9 اپریل کو منانی شروع کردی۔

میری پک فورڈ کی زندگی تضادات سے بھری ہوئی ہے ۔ایک زمانے میں وہ اپنے کپڑے خود دھوتی اور اپنی خوراک پر آٹھ پنس یومیہ خرچ کرتی تھی ۔لیکن بارہ برس بعد وہ دوسو پونڈ فی گھنٹہ کے حساب سے کمانے لگی ۔یعنی تین پونڈ فی سیکنڈ۔

بچپن میں جب وہ بے کار اور بے گھر ہوا کرتی تھی تو اس کی والدہ چند پیسے بچا کر بچوں کے لئے حلوہ بنایا کرتی تھی ۔آج بھی حلوہ میری پک فورڈ کا من بھاتا کھاجا ہے۔

اس کے باوجود اسے کسی قسم کے کھانے سے کوئی خاص دل چسپی نہیں ہے ۔ایک دفعہ میں اسے شام کے چھ بجے ملنے کے لئے گیا تھا۔اس نے مجھے بتایا کہ اس نے صبح سے سوائے چائے کی پیالی اور ایک توس کے کچھ نہیں کھایا۔جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے بھوک نہیں لگتی تو اس نے جواب دیا ’’نہیں بالکل نہیں۔‘‘

کئی برس پہلے اس نے اپٹون سنکلیر کی کتاب ’’جنگل‘‘ پڑھی تھی ۔اس کتاب کے مطالعے کے بعد اس نے کبھی زیادہ گوشت نہیں کھایا اور قصائی کی دکان دیکھ کر اس کی طبیعت کئی گھنٹے خراب رہتی تھی ۔بچپن میں وہ ایک پالتو دنبے سے کھیلا کرتی تھی ۔جب کبھی اس کے سامنے بھنا ہوا گوشت رکھا جاتا تو اس دنبے کی یاد وہ بھنا ہوا گوشت اسے کھانے نہیں دیتی ۔جس مچھلی کا شکار اس نے خود کیا ہو۔وہ اسے بھی

کھانے سے قاصر رہتی، لیکن دوسروں کی شکار کی ہوئی مچھلی کھانے میں اسے کوئی تامل نہیں ہوتا۔

میری پک فورڈ کا کہنا ہے کہ انسانی خواہشات ایک لعنت سے کم نہیں۔ یہ آپ کو ہر وقت سولی پر لٹکائے رکھتی ہیں۔ اسے سیر اور گھڑ سواری کا شوق ہے۔ لیکن ان دونوں کے لئے اسے شاذ ہی وقت ملا ہو۔ وہ ہر روز بارہ سے سولہ گھنٹے روزانہ کام کرتی ہے۔ اس کے پاس کئی سیکرٹری اور ملازم ہیں۔ لیکن اس کا اصول ہے کہ اپنے ہاتھوں سے کیا ہوا کام زیادہ اچھا ہوتا ہے۔

ایک لمحہ بھی ضائع کرنا اسے پسند نہیں۔ وہ اپنی فرانسیسی کی اصلاح کے لئے ہر وقت اپنے ساتھ ایک ساتھی رکھتی ہے۔

دنیا کے کسی دوسرے شخص کی نسبت اس کے پاس سب سے زیادہ خطوط آتے ہیں فقط یہ خطوط پڑھنے کے لئے اسے ہر روز دس گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔ ان میں بہت سے خطوں میں لوگوں نے اس سے مالی امداد کی درخواست کی ہوتی ہے۔ اور یہ مطالبہ اس کی آمدنی سے دس گنا زیادہ ہوتا ہے۔

میری پک فورڈ حقیقت میں ایک پیاری شخصیت ہے۔ خلوص اور ایثار کا مجسمہ۔ اس کی شہرت نے اس کا دماغ خراب نہیں کیا۔

جب میں نے مس میری پک فورڈ سے پوچھا کہ ہالی وڈ کی طرح امریکہ میں اور بھی ہزاروں خوب صورت اور صلاحیتوں کی مالک لڑکیاں موجود ہیں۔ انہیں آگے آنے کا موقع کیوں نہیں ملتا تو اس نے جواب دیا کہ دراصل کامیابی کا انحصار موقع

دستیاب ہونے پر ہے۔میرے خیال میں ہالی وڈ میں وہی لوگ فلمی ستارے بنتے ہیں جنہیں یہ پیشہ اختیار کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔اور موقع ہر کسی کو نہیں ملتا۔

میری یک فورڈک اباپ کینیڈا اور نیویارک کے درمیان چلنے والے بحری جہازوں کی ایک کمپنی میں ملازم تھا میری ابھی چار برس کی تھی کہ اس کا باپ جہاز کے ایک حادثے میں فوت ہوگیا۔اس کا نام جون سمتھ تھا۔اگر اسے دنیا میں دوبارہ آنے کا اتفاق ہو تو اسے یہ دیکھ کر کتنی حیرت ہو کہ اس کی ننھی گلیڈی دنیا کی ایک اہم اور نامور شخصیت بن چکی ہے۔

☆☆☆

ال جولسن

چھ ماہ گھر بے کار بیٹھنے پر اسے دو لاکھ پونڈ ملے

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میں ہالی وڈ کے فقط ایک ایسے ایکٹر کو جانتا ہوں جس نے 2,000,000 لاکھ پونڈ کا معاہدہ پھاڑ دیا تھا۔

آپ نے اسے فلموں میں دیکھا ہو گا۔ اس کے گانے گائے ہوں گے، اس کے لطیفوں پر ہنسے ہوں گے۔ اس نے پہلی بولنے والی فلم بنائی تھی۔ ہالی وڈ کی آج تک سب سے زیادہ نفع کمانے والی فلم بھی اسی نے بنائی تھی۔ اس فلم نے 24,000,000 لاکھ پونڈ نفع کمایا۔ ہالی وڈ کی کوئی فلم آج تک یہ ریکارڈ توڑ نہ سکی۔

اس فلم کا نام ''احمق گویا'' تھا اور اس میں ال جولسن نے کام کیا تھا۔

ایک زمانے میں ال جولسن 6250 پونڈ ہفتہ وار تنخواہ حاصل کرتا تھا، اور یہ تنخواہ وہ چھ ماہ تک کوئی کام کیے بغیر حاصل کرتا رہا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس نے گھر بیٹھے بٹھائے بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے دو لاکھ پونڈ حاصل کر لیے تھے۔ لیکن یاد رہے کہ وہ ہر وقت کام کرنے کا تیار تھا۔ لیکن اسے ملازم رکھنے والے ادارے یونائیٹڈ آرٹسٹس کے پاس کوئی فلمی کہانی نہ تھی۔ لہٰذا وہ سارا دن گاف کھیلتا رہتا تھا۔ اور ہر ہفتے گھر بیٹھے بٹھائے تنخواہ لے لیتا تھا۔ اس تنخواہ کے سامنے امریکہ کے صدر کی تنخواہ ایک سٹینو گرافر کی تنخواہ دکھائی دیتی ہے۔

پھر اس نے ایک ایسا غیر متوقع فراخ دلانہ کام کیا۔ جس نے ہالی وڈ کا تاریک ماحول روشن کر دیا۔ امریکہ مالی بحران کی زد میں آ گیا تھا۔ یونائیٹڈ آرٹسٹس ادارے کے کرتا دھرتا جوزف سکنک کو بے حد نقصان اٹھانا پڑا۔ ابھی اس نے جول سن کو دو لاکھ پونڈ کی رقم دینی تھی۔ لیکن جول سن نے وہ معاہدہ جوزف سکنک کی موجودگی میں پھاڑتے ہوئے کہا "اسے بھول جاؤ میں کبھی اس رقم کا مطالبہ نہیں کروں گا۔"

ایک دفعہ لوہے کے ایک تاجر چارلس سکوب نے دو لاکھ پونڈ تنخواہ کا معاہدہ پھاڑ کر امریکہ کے کاروباری حلقے میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ لیکن ایک زمانے میں مفلوک الحال اس ایکٹر نے ایک ایسا معاہدہ پھاڑ دیا تھا۔ جس کی رو سے اسے چار لاکھ سالانہ پونڈ ملنے تھے۔ کسی نے اسے ایسا کرنے کے لئے نہ کہا تھا۔ اور نہ ہی کسی کو امید تھی کہ وہ ایسا کر گزرے گا۔

بچپن میں ال جول سن تپ دق کا شکار ہو گیا۔ جب وہ علاج کے لئے کسی خیراتی اسپتال میں گیا تو ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ اگر وہ ایک دم کسی گاؤں میں نہ چلا گیا تو وہ چھ ماہ کے اندر مر جائے گا۔ جو نسخہ اور دوا انہوں نے دی مفت تھی۔ لیکن جب وہ دوا لینے گا تو اسے معلوم ہوا کہ اسے چھ پنس بوتل کی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ لیکن اس کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ لہذا وہ دوا لیے بغیر واپس آ گیا۔

بہر حال وہ کسی اور ڈاکٹر کی مدد کے بغیر ہی تندرست ہو گیا۔ مگر یہ بات اس کے ذہن میں ثبت ہو کر رہ گئی کہ پیسے کے بغیر انسان کس طرح کس مپرسی کی حالت میں

مر سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نیو یارک میں تپ دق کے ایک کلینک کو چار ہزار پونڈ سالانہ دیا کرتا تھا۔ اور یہ سلسلہ اس نے گیارہ برس تک جاری رکھا۔ اس نے ہزاروں لوگوں کی زندگیاں بچائیں۔

مجھے لوگوں کی تاریخ پیدائش کے متعلق بڑا تجسس رہتا ہے۔ لیکن جب میں نے ال جول سن سے اس کی تاریخ پیدائش پوچھی تو اس نے بتایا کہ اسے خود بھی معلوم نہ تھی۔ وہ روس میں غریب والدین کے گھر پیدا ہوا تھا۔ گھاس پھوس کی ایک جھونپڑی میں، یہ ایسا ماحول ہوتا ہے، جس میں ہر سال دوسرے سال سے یکسانیت رکھتا ہے۔ لہذا اس کے والدین نے یوم پیدائش جیسی معمولی بات کو یاد رکھنے کی کوشش نہ کی۔ لہذا اسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ کیا وہ 1885ء 1886ء, 1888ء میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن نامور ہونے کے بعد اس کے دوست احباب اسے اس کی سالگرہ پر تحائف دینا چاہتے تھے۔ لہذا اسے مجبوراً سالگرہ کا دن چننا پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ خزاں کے موسم میں پیدا ہونا کاروباری نقطہ نظر سے خسارے کا سودا ہوگا۔ کیونکہ اس زمانے میں ایکٹروں کی اکثریت فاقہ مست ہوتی ہے۔ لیکن موسم بہار کے آتے ہی ان کی جیبیں گرم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ چونکہ مئی کا مہینہ بے حد خوشگوار ہوتا ہے۔ لہذا اس نے اسی ماہ پیدا ہونا پسند کیا۔ 26 مئی 1888ء کو اس نے تسلیم کیا تھا۔ یہ تاریخ اس کی صحیح تاریخ پیدائش نہ تھی۔ مگر اس کے لگ بھگ ضرور ہے۔ زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال کا فرق پڑ سکتا ہے۔

ال جول سن نے پہلی بار ایک بچے کی حیثیت سے سٹیج پر کام کیا تھا۔ اس کھیل کا

نام ''گیتو کے بچے'' تھا۔ اور اس میں اسے فقط یہ جملہ ادا کرنا تھا۔ ''یہودیوں کو مار ڈالو۔''

اس کے والد کو اس زمانے میں یہودیوں کے ایک ذبح خانے میں جانور ذبح کرنے کی ملازمت ملی تھی۔ جب اس نے اپنے بیٹے کی زبان سے یہ فقرہ سنا ''یہودیوں کو مار ڈالو'' تو اس نے اپنے بیٹے کا تھیٹر جانا بند کر دیا۔

جب ال جول سن پہلے پہل نیویارک گیا تو وہ بالکل مفلوک الحال تھا۔ واشنگٹن سے اس نے بغیر ٹکٹ کے سفر کیا۔ وہ اس قدر سادہ لوح آدمی تھا کہ نیوجرسی کے شہر کو نیو آرک نیویارک سمجھ کر وہاں اتر پڑا۔ وہاں اسے ایک باغ میں گھاس پر رات بسر کرنا پڑی۔ صبح جب وہ بیدار ہوا تو مچھروں نے رات بھر کاٹ کاٹ کر اس کا برا حال کر دیا تھا۔ اس کا سارا جسم سوج گیا تھا۔

آخر کار جب وہ نیویارک پہنچا تو شروع شروع میں اسے عوامی باغوں میں بنچوں پر اور بندرگاہ کے قریب ٹرکوں کے نیچے سونا پڑا۔ کئی کئی دن اسے کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات اسے کھانے کے لئے چوری کرنا پڑتی تھی۔

لی سکوبرٹ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ امریکہ میں فقط دو ایسے ایکٹر ہیں، جو کسی شہر میں جا کر وہاں کے کسی تھیٹر کو تماشائیوں سے بھر سکتے ہیں۔ ایک فریڈ سٹون اور دوسرا ال جول سن۔

ال جول سن نے مجھے بتایا کہ جب وہ پہلی دفعہ ونٹر گارڈن تھیٹر کے سٹیج پر نمودار ہوا تو اس کی دلی حالت بے حد خستہ تھی۔ وہ کھیل بڑا طویل تھا۔ اور اس کی باری نصف

شب سے پہلے نہ آئی تھی۔ جب وہ سٹیج پر گیا تو لوگوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ کسی نے کوئی تالی وغیرہ نہ بجائی۔ کھیل ختم ہونے پر وہ دل شکنی کی حالت میں گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ چون (54) نمبر اسٹریٹ میں رہتا تھا۔ لیکن وہ اپنی غنودگی کے عالم میں انیسویں (19) سٹریٹ میں چلا گیا۔ چھیالیس بلاک ڈور۔ وہاں پہنچ کر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

یہ بات کبھی اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ کہ ایک روز اس کا نام نیو یارک کے نامور تھیٹر براڈوے میں رنگین روشنیوں کے درمیان چمکا کرے گا۔ اور تھیٹروں کے مینجر اسے ایک منٹ کا معاوضہ چالیس شانگ دینے کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے۔

کیتھرین ہپ برن

وہ تین سو پونڈ ہفتہ وار کمانے کے باوجود جہاز کے تیسرے درجے میں سفر کیا کرتی تھی۔

زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ایک رات کونکٹی کٹ میں سرخ بالوں والی ایک چھوٹی لڑکی اپنے سکول کے سٹیج پر بڑے اعتماد کے ساتھ "بلن ہم کی لڑائی" نامی منظوم نظم پڑھنے کے لئے گئی۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے خالی تھا۔ سامعین میں اس کے والدین اور پانچ بہن بھائی بھی بیٹھے تھے۔ سکول میں کوئی سالانہ تقریب تھی۔ لیکن جونہی کیتھرین سٹیج پر آئی۔ اور اس نے نظم کی پہلی سطر ادا کرنے کے لئے لب کھولے۔ اس پر سامعین کا خوف طاری ہو گیا۔ اور اس کی زبان نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ گھبراہٹ کے عالم میں اس کی گھگھی بندھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے، آخر کار بے عزتی کا احساس لیے وہ مڑی اور بھاگ گئی۔

اس وقت کیتھرین ہپ برن کی عمر صرف تیرہ برس تھی۔ لیکن اس سے دوگنی عمر میں وہ فلموں میں کام کر کے انعامات اور تمغے حاصل کر رہی تھی۔ 1933ء میں اسے "صبح کی عظمت" اور 1934ء میں اسے "ننھی بیویاں" نامی فلموں میں کام کرنے پر انعام ملا تھا۔

ابھی اس نے تعلیم سے فراغت ہی پائی تھی کہ دیوتا اس پر مہربان ہو گئے۔ سٹیج پر

فقط دو ہفتے کام کرنے کے بعد اسے براڈوے کے ''بڑا تالاب'' نامی ڈرامے میں ایک اہم کردار مل گیا۔ یہ غیر معمولی بات تھی۔ لیکن ڈرامے کی ریہرسل کے دوران وہ اکثر ڈائریکٹر سے اس بات پر بحث کرتی رہتی کہ اسے اپنا کردار کس انداز میں انجام دینا چاہیئے۔ ڈرامے کا ڈائریکٹر اپنی بات منوانے پر تلا ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے ڈرامے سے نکال دیا گیا۔

اگلی دفعہ اسے ''موت کی چھٹی'' نامی ایک دوسرے ڈرامے میں ایک اہم کردار دیا گیا۔ لیکن اس دفعہ بھی اس کی بحث اور نکتہ چینی کی عادت نے بنا بنایا کام بگاڑ دیا۔ اور اسے نااہل سمجھ کر پھر کھیل سے الگ کر دیا گیا۔

پھر ایک اور سنہری موقعہ پکے پھل کی طرح اس کی جھولی میں خود بخود آن گرا۔ اسے ''جانوروں کی دنیا'' میں لسلی ہاورڈ کے بالمقابل ایک کردار دیا گیا۔ وہ سٹیج پر اپنا لوہا منوانے کے لئے بے قرار تھی۔ لہذا وہ ڈرامے سے کئی ماہ پیشتر اپنا کردار کا مطالعہ کرتی رہی۔ لیکن جب ڈرامے کی ریہرسل شروع ہوئی تو پھر وہی پرانی کہانی دہرائی گئی۔ اسے دوسروں کے مشوروں سے نفرت تھی۔ وہ اپنے خیال کے مطابق اپنا رول ادا کرنے پر مصر تھی۔ اب کے پھر اسے ڈرامے کی کاسٹ سے نکال دیا گیا۔ ممکن ہے آپ اسے احمق کہیں اور اس کی مذمت کریں لیکن ٹھہریں ذرا دم لیں۔ میں آپ کے سامنے اس کے نظریے کی وضاحت کیے دیتا ہوں۔ کیتھرین ہیپ برن کا کہنا ہے کہ ''میرا یقین ہے'' کہ میں اگر اپنے انداز میں اپنا کردار ادا کروں گی تو کامیاب رہوں گی۔ میں جانتی تھی کہ دوسروں کے مشوروں پر عمل کرنے سے میرے

کام میں دل کی لگن شامل نہ ہو گی۔ اور میں ناکام ہو جاؤں گی۔ میرے خیال میں وہ بالکل حق بجانب تھی۔

اس کا والد ایک فزیشن تھا۔ اس نے گھر میں ایک ورزش گاہ بنا رکھی تھی۔ جہاں اس کے چھ بچے ورزش کیا کرتے۔ اور ایک دوسرے کو ہوا میں اچھال کر دبوچنے کی مشق کیا کرتے تھے۔ کیتھرین اس فن میں اس قدر ماہر ہو گئی تھی کہ وہ اپنے وزن سے دوگنے وزن کا شخص ہوا میں اچھال کر دبوچ لیتی تھی۔ غوطہ لگانے میں بھی اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ گاف کی وہ اتنی اچھی کھلاڑی تھی کہ ایک زمانے میں وہ اداکاری ترک کر کے گاف کا پیشہ ور کھلاڑی بننے کا سوچنے لگی۔ اس کے یہ سب کرتب براڈوے کے کھیل "سپاہی خاوند" میں اس کے کام آئے۔ اسی کھیل سے وہ تھیٹر کی دنیا میں نامور ہوئی تھی۔

سٹیج پر اس کی نمایاں اداکاری سے متاثر ہو کر ہالی وڈ والوں نے اس کا سکرین ٹسٹ لیا۔ اور تار کے ذریعے اس سے دریافت کیا، کہ فلموں میں کام کرنے کا کیا معاوضہ لے گی؟۔ ہالی وڈ والوں کا خیال تھا کہ وہ چالیس یا پچاس پونڈ ہفتہ وار تنخواہ سے زیادہ نہ بڑھے گی۔ لہذا جب اس کے ایجنٹ نے تار کے ذریعے ہالی وڈ والوں کو اطلاع دی کہ مس کیتھرین ہیپ برن 300 پونڈ ہفتہ وار تنخواہ پر کام کرنے کے لئے رضامند ہو سکتی ہے۔ تو انہوں نے سمجھا کہ اس کے ایجنٹ سے غلطی ہو گئی ہے، اور اس نے ایک صفر زیادہ لگا دیا ہے۔ یا تار گھر والوں سے غلطی ہو گئی ہے۔ انہوں نے دوبارہ اس کے ایجنٹ کو تار دے کر وضاحت طلب کی۔ تو اس نے جواب میں لکھا

کہ نہ تو مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ اور نہ ہی تار گھر والوں سے۔ 300 پونڈ ہفتہ وار تنخواہ بھی کم ہے۔"

جب کیتھرین ہالی وڈ پہنچی تو اس کے ڈائریکٹر جارج گوکر نے اسے دیکھ کر کہا کہ اس کے بال تراش کے حاجت مند ہیں۔ اور اس کا لباس دیکھ کر دوسرا شرمندہ ہو جاتا ہے۔

کیتھرین ہپ برن نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا "آپ کا کیا مطلب ہے یہ لباس تو میں نے پیرس کے بہترین درزی سے سلوایا ہے۔"

لیکن میں نے اپنی زندگی میں اس سے برا لباس نہیں دیکھا۔ جارج گوکر نے جواب دیا "کوئی خوش لباس خاتون ایسا لباس پہن کر اپنی خواب گاہ سے باہر نہیں نکل سکتی۔" کیتھرین ہپ برن پہلے تو گھبرا گئی مگر پھر گھبراہٹ دور کرنے کے لئے ہنسنے لگی۔

ایک ماہر نفسیات بننے کے لئے کیتھرین ہپ برن چار سال تک نفسیات کا مطالعہ کرتی رہی۔ اسے عورتوں جیسے نخرے پسند نہ تھے۔ وہ عجیب وغریب لباس اور کوہ پیمائی والے جوتے پہن کر ہالی وڈ والوں کو حیران کر دیا کرتی تھی۔

اس کی آنکھیں سبزی مائل نیلی اور بال سرخ تھے۔ جن دنوں وہ کسی فلم میں کام کر رہی ہوتی تو وہ ہر روز اپنے بالوں کو شیمپو کیا کرتی تھی۔ جس سے وہ شعلے کی طرح دمکنے لگتے۔

ایک دفعہ جب وہ کالج میں رقص کر رہی تھی تو ایک نوجوان سے بے خبری میں

ٹکرا گئی۔ جب وہ معافی مانگنے کے لئے پیچھے ہٹا تو کیتھرین ہپ برن اسے غصیلی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ نوجوان کیتھرین کی اس ادا پر مر مٹا۔ چند ہی روز میں وہ ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ اور چاندنی راتوں میں اس کے درمیان عہد و پیان ہونے لگے۔ چھ ماہ بعد انہوں نے شادی کر لی۔ بعد میں وہ جدا ہو گئے۔ اس واقعے کے متعلق کیتھرین ہپ برن نے فقط یہ الفاظ کہے تھے "ہمارے لئے صرف یہی بہترین راہ عمل تھی۔"

اس نے بحری جہاز کے تیسرے درجے میں سات دفعہ یورپ کا سفر کیا۔ ایک دفعہ اس زمانے میں جب ہالی وڈ اسے تین سو پونڈ ہفتہ وار دیا کرتا تھا۔ وہ اول درجے کی ٹکٹ خرید کر روپیہ ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اور کہا کرتی تھی "جہاز میں بیٹھ کر میں اتنی بیمار ہو جاتی ہوں کہ مجھے یہ ہوش ہی نہیں رہتا کہ میں اول درجے میں سفر کر رہی ہوں یا تیسرے درجے میں۔"

کاروباری معاملے میں وہ بے حد تیز تھی۔ ایک فلم میں کام مکمل کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اسے ایک مزید منظر میں کام کرنا پڑے گا۔ اسے بلایا گیا۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس نے ایک دن مزید کام کرنے کا معاوضہ دو ہزار پونڈ لیے تھے۔ فلمی تاریخ میں فقط وہی ایک ایسی لڑکی ہے۔ جس نے ایسا کیا ہے۔



ہیرلڈ لائیڈ

بیس برس کی عمر سے پہلے اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے اندر مزاح کا عنصر موجود ہے

ہیرلڈ لائیڈ کو پہلی دفعہ دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوا۔ بہتر تھا کہ میں اسے پردہ سیمیں پر دیکھنے کے بعد حقیقی دنیا میں نہ ہی دیکھتا۔ وہ لوگوں کے اس خیال سے خود بھی متفق ہے۔ اور کہتا ہے کہ وہ حقیقی دنیا میں لوگوں کے سامنے آ کر انہیں صدمہ پہنچانے کے حق میں نہیں ہے۔

مثلاً ایک دفعہ وہ اپنے دوست کے ہمراہ ایک پارٹی میں آیا۔ اس کے دوست نے عینک لگا رکھی تھی۔ (ہیرلڈ لائیڈ اپنی روزمرہ زندگی میں عینک استعمال نہیں کرتا تھا۔) اس کے دوست کی شکل بھی اس سے نہ ملتی تھی۔ لیکن ہر کسی نے یہی سمجھا کہ دھاریوں والا عینک والا لڑکا ہیرلڈ لائیڈ ہی ہے۔ اس کا دوست لوگوں سے بار بار کہہ رہا تھا کہ جناب آپ سے غلطی ہوئی ہے۔ میں ہیرلڈ لائیڈ نہیں ہوں۔۔۔۔ وہ وہاں بیٹھا ہے ۔۔۔۔ لیکن مہمانوں کا خیال تھا کہ وہ اس وقت بھی مذاق کے موڈ میں تھا۔

میں نے ہیرلڈ لائیڈ کو ہمیشہ خاموش طبع اور محنتی خیال کیا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے میں نے گھنٹوں اس سے گفتگو کی ہے۔ اس دوران میں اس کے قہقہوں کا طوفان لمحہ بھر کے لئے نہیں رکتا۔ آپ سمجھیں گے اس کی تربیت ٹھیک طور

پر نہیں ہوئی۔ یہ بات نہیں وہ بڑا جمہوریت پسند اور پر خلوص ہے۔

ہیر لڈلا ئیڈ تو ہمات سے سخت نفرت کرتا ہے۔ وہ انہیں زمانہ جہالیت کی پیداوار خیال کرتا ہے۔ اس کے باوجود وہ چند ایک تو ہمات کا شکار ہے۔ مثال کے طور پر وہ لاس آنجلز کی ایک سرنگ میں سے ہرگز نہیں گزرتا۔ کیونکہ اس کا خیال ہے اس سرنگ میں سے گزرنا بد قسمتی کو دعوت دینا ہے۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ جس دروازے سے کسی مکان میں داخل ہو اسی سے باہر نکلے۔ وہ اپنی جیب میں ہر وقت چند بابرکت سکے رکھتا ہے۔

اس کی تازہ ترین ہابی مصوری ہے۔ وہ جادو اور تاش کے کھیلوں سے اپنے دوستوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ کتے پالنے کا اسے بے حد شوق ہے۔ ایک زمانے میں اس کے پاس ستر (70) سے زیادہ کتے تھے۔

اس نے مجھے ایک معمولی واقعہ سنایا، جو اس کی زندگی میں بارہ برس پہلے رونما ہوا تھا۔ مگر اس نے ہیر لڈلا ئیڈ کی زندگی کا رخ بدل دیا۔

ایک دن جب وہ اوہاما (نبر سکا) میں سکول سے چھٹی کے بعد گھر واپس جا رہا تھا تو راستے میں اسے ایک گلی کی نکڑ پر ایک نجومی دکھائی دیا۔ جس نے اپنے چاروں طرف چارٹ وغیرہ پھیلا رکھے تھے۔ اس نجومی کا دعویٰ تھا کہ وہ آپ کے ستاروں کو دیکھ کر آپ کی قسمت بتا سکتا ہے۔ ننھا ہیر لڈلا ئیڈ حیرت زدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اچانک آگ بجھانے والا انجن گزرا اور لڑکے اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے۔ لیکن وہ وہیں کھڑا نجومی کی باتیں سنتا رہا۔ لڑکے کو نجومی کی باتیں

بڑی عجیب وغریب محسوس ہو رہی تھیں۔ ہجوم میں کھڑا ایک شخص یہ بات نوٹ کر رہا تھا۔ اس شخص کا نام جون لین کونور تھا۔ جو اوہاما کی بروڈ سٹاک کمپنی کا کرتا دھرتا تھا۔ وہ ہیرلڈ لائیڈ کے پاس گیا اور اس سے کہنے لگا کہ کیا یہاں کوئی ایسی جگہ ہے۔ جہاں ایکٹروں کی رہائش اور خوراک کا انتظام ہو سکے۔؟ خوشی سے ہیرلڈ لائیڈ کی باچھیں کھل گئیں۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو بروڈ سٹاک کمپنی کے تمام ایکٹروں کو اپنے گھر ٹھہرا لیتا۔ کئی برس سے وہ ایکٹر بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔

اس نے اپنے گھر کے ایک تہہ خانے میں ایک اسٹیج بنا رکھا تھا۔ وہ بچوں کے لئے ڈرامے لکھتا اور انہیں اسٹیج کرتا تھا۔ ایسے ڈرامے دیکھنے کے لئے محلے بھر کے لڑکے آتے۔ اور وہ ہر لڑکے سے تین پنس بطور ٹکٹ کے وصول کرتا تھا۔

اس وقت سے مقامی تھیٹریکل کمپنی کو جب کبھی بچے کے کردار کے لئے کسی لڑکے کی ضرورت ہوتی تو ان کی یہ ضرورت ہیرلڈ لائیڈ ہی پوری کرتا تھا۔

ہیرلڈ لائیڈ کا والد سلائی مشین فروخت کرنے کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ ایک دن کار کے ایک حادثے میں اس کی پشت پر گہری چوٹ لگی۔ اور اسے بیمہ کمپنی کی طرف سے سات سو پونڈ مل گئے۔ یہ خدا کی دین تھی۔ لہٰذا اس نے وہ شہر چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں رہائش اختیار کر کے قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ کس شہر میں جائے ان کے خاندان کے کچھ افراد تو کیلی فورنیا میں اور کچھ نیو یارک میں مقیم تھے۔

آخر ہیرلڈ لائیڈ کے باپ نے کہا ”ہم ٹاس کرتے ہیں۔“ اگر سر آ گیا تو ہم نیو یارک جائیں گے اور اگر دم آ گئی تو ہم کیلی فورنیا جائیں گے۔

سکہ ہوا میں اچھالا گیا تو سر آیا۔ لہٰذا ہیرلڈ لائیڈ کا سارا کنبہ شہر سان واَنجو چلا گیا۔ وہاں ہیرلڈ لائیڈ مقامی تھیٹر میں چھوٹے موٹے کردار ادا کرنے لگا۔ آخر اسے فلموں میں کام کرنے کا موقعہ بھی ملنے لگا۔ پہلی دفعہ اسے فلم میں ایک انڈین کا رول ملا۔ جس نے پھلوں کی ایک طشتری چند سفید فام لوگوں کے حوالے کرنی تھی۔ اس زمانے میں اس کا خیال تھا کہ فلمی صنعت زیادہ ترقی نہیں کرے گی۔ لیکن جب وہ بھوکا مرنے لگا تو اس نے فلموں میں باقاعدہ کام کرنے کے متعلق سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔

وہ ہر روز ڈائریکٹروں سے ملنے جاتا۔ مگر کوئی اسے منہ نہ لگاتا تھا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ ایک فلم کمپنی کے ایکٹر وغیرہ ایک کمرے سے نکل کر دوپہر کے کھانے کے لئے سڑک کے پار دوسرے کمرے میں جا رہے ہیں۔ کھانے کے بعد جب وہ واپس آئے تو چوکیدار نے بلا تامل انہیں اندر چلے جانے دیا۔

اس سے پہلے ہیرلڈ لائیڈ نے جب بھی اس کمپنی میں داخل ہونے کی کوشش کی تو چوکیدار اس کے راستے کی دیوار بن جاتا۔ اسے ایک ترکیب سوجھی۔ دوسرے دن جب ایکٹر کھانے سے فارغ ہو کر میک اپ روم میں داخل ہونے لگے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہولیا۔

کئی دن وہ بغیر کسی کام کے وہاں بیٹھا ایکٹروں سے گپ بازی میں مشغول رہتا۔ وہ اسے پسند کرنے لگے تھے۔ جب کبھی چوکیدار اسے اندر نہ گھسنے دیتا تو وہ لوگ اسے کھڑکی کے راستے کمرے میں کھینچ لیتے۔

ان ایکٹروں میں ہال روچ نامی ایک ایکٹر بھی تھا۔ اس نے ایک روز ہیرلڈ

لائیڈ کو بتایا کہ اس کی چچی فوت ہوگئی ہے۔ اور وہ اس کے نام کچھ رقم چھوڑ گئی ہے۔ اس رقم سے اس کا ارادہ فلم بنانے کا ہے۔ وہ مزاحیہ فلم ہوگی۔ اور ہیرلڈ لائیڈ کو وہ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی رول دے گا۔

ہیرلڈ لائیڈ نے ابتداء میں ایک ریل کی مزاحیہ فلموں میں کام کرنا شروع کیا۔ وہ عجیب وغریب پتلونیں پہن کر چارلی چپلن کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا۔

ایک روز اتفاقیہ طور پر اسے ایک ایسا خیال سوجھا کہ جس نے اس کی قسمت بدل دی۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ لہٰذا تفریح کے لئے وہ ایک تھیٹر میں چلا گیا۔ وہاں اس نے ایک ایکٹر دیکھا جس نے تنکوں کا ہیٹ اور دھاریوں والے فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ وہ ایک مبلغ کا رول ادا کر رہا تھا۔ وہ ایکٹر ہرگز مزاحیہ بننے کی کوشش میں نہ تھا۔ لیکن ہیرلڈ لائیڈ نے اسی وقت دھاریوں والے فریم کی عینک کو اپنا امتیازی نشان بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس ذرا سی تبدیلی نے اسے بے حد نامور کردیا۔

ہیرلڈ لائیڈ کے متعلق سب سے مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ بیس برس کی عمر سے پہلے اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ اس میں مزاح کا عنصر موجود ہے۔ اس سے پہلے وہ شیکسپئر کے ڈرامے پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ جب اس نے فلموں میں کام شروع کیا تو ڈائریکٹر اسے بار بار کہتے تھے کہ وہ مزاحیہ حرکتیں مت کرے۔ کیونکہ وہ ہرگز کامیڈین نہیں بن سکتا۔ اور اسے روزی کمانے کا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ لیکن اس نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور آج اس کا شمار دنیا کے امیر ترین ایکٹروں میں ہوتا ہے۔

☆☆☆

محنتی لوگ

کلیرنس ڈیرو

وہ فقط ایک پونڈ فیس پر سات برس تک مختلف عدالتوں میں مقدمہ لڑتا رہا

آج سے کوئی پچھتر سال پہلے ایک سکول کی معلّمہ روزانہ کلاس میں ایک چھوٹے سے لڑکے کے کان کھینچا کرتی تھی۔ کیونکہ یہ لڑکا اپنی جگہ پر نچلا نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اور یونہی اٹھ کر ادھر ادھر دیکھتا رہتا ہے۔ وہ پوری کلاس کے سامنے اس کے کان کھینچتی، اور اتنی اس کی بے عزتی کرتی کہ وہ گھر جاتے ہوئے سارے راستے روتا جاتا تھا۔ اس وقت اس لڑکے کی عمر صرف پانچ سال کی تھی۔ لیکن اس عمر میں بھی اسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس کے ساتھ ظالمانہ اور غیر منصفانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ اس طرح اسے ظلم اور بے انصافی سے نفرت ہو گئی۔ اور اس جذبے کے تحت وہ عمر بھر جدو جہد کرتا رہا۔

اس لڑکے کا نام کلیرنس ڈیرو تھا۔ جو امریکہ میں غالباً اپنے وقت کا مشہور ترین وکیل تھا۔ اور یہ بات تو خیر پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس وقت فوجداری کے مقدمات میں تو اس کے پائے کا کوئی بھی وکیل نہیں تھا۔ ملک کے تمام مشہور روز نامے اس کے مقدمات کی خبریں بڑی سرخیوں کے ساتھ شائع کرتے تھے۔

اس نے جو پہلا مقدمہ لڑا۔ (اشتابولا) اوہیو کے پرانے لوگوں کے دلوں میں

اب بھی اس کی یاد باقی ہے۔ اس مقدمے میں کوئی لاکھوں روپے کی جائیداد کا نہیں بصرف گھوڑے کی ایک پرانی زین کا جھگڑا تھا۔ جس کی قیمت مشکل سے ایک پونڈ ہوگی۔ لیکن کلیرنس ڈیرو کے نزدیک یہ ایک اصول کا سوال تھا۔ بے انصافی نے سر اٹھایا تھا۔ اس نے یہ مقدمہ لڑنے میں اتنی جان ماری کہ جیسے وہ کسی شیر کے ساتھ نبرد آزما ہو۔

اس مقدمہ کا معاوضہ صرف ایک پونڈ تھا۔ اس نے اس مقدمے پر اپنی جیب سے بہت سارو پیہ خرچ کیا۔ اور آخر سات سال عدالتوں کی خاک چھاننے کے بعد مقدمہ جیت لیا۔

ڈیرو کہتا ہے کہ اس نے کبھی روپے پیسے کا یا عزت افزائی کا لالچ نہیں کیا۔ وہ اپنے متعلق یہ بھی کہتا ہے کہ وہ انتہائی سست ہے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں اس نے ایک دیہاتی مدرسے میں پڑھانا شروع کیا۔ اس دوران ایک روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس سے اس کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ جس گاؤں میں یہ مدرسہ تھا۔ وہاں ایک لوہار بھی رہتا تھا۔ جو اپنی دکانداری سے وقت نکال کر قانون کی تعلیم حاصل کیا کرتا تھا۔

ڈیرو لوہار کی اس لگن سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے کتابیں مانگیں اور خود بھی مطالعہ شروع کر دیا۔ سکول میں اسے جو بھی وقت ملتا، وہ اپنی کتابوں پر صرف کرتا۔

ڈیرو بتاتا ہے کہ اگر اس کی زندگی میں یہ ایک واقعہ پیش نہ آتا تو شاید وہ عمر بھر دیہاتی عدالتوں میں پڑا رہتا۔

ہوا یوں کہ اس نے اور اس کی بیوی نے ایک دندان ساز سے اشتبھولا میں (اوہیو) میں ایک چھوٹا سا گھر خریدنے کا ارادہ کیا۔ مکان کی قیمت سات سو پونڈ تھی۔ ڈیرو نے بنک سے سو پونڈ نکلوائے (اور سر راہے یہ بھی سن لیجیے کہ اس کی تمام پونجی ہی اتنی تھی۔) اور مالک مکان سے یہ شرط طے کی کہ وہ باقی رقم وہ سالانہ قسطوں میں ادا کرے گا۔ معاہدے کی تمام تفصیلات طے ہو چکی تھیں کہ عین وقت پر دندان ساز کی بیوی نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

اس نے ڈیرو کی طرف حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو نوجوان کھری بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ امید نہیں کہ تم زندگی بھر سات سو پونڈ کما سکو گے۔"

ڈیرو یہ سن کر تلملا گیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ ایسے گاؤں میں نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہ اشتبھولا کو خیرباد کہہ کر شکاگو چلا گیا۔

شکاگو آنے کے بعد اس کے پہلے سال کی آمدنی صرف ساٹھ پاؤنڈ تھی۔ اتنی قلیل آمدنی میں وہ اپنے کمرے تک کا کرایہ آسانی سے ادا نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن دوسرے سال یہ آمدنی دس گنا ہو گئی یعنی چھ سو پونڈ۔ اب ڈیرو شہر میں خاص اٹارنی بن چکا تھا۔

ڈیرو کا کہنا ہے کہ جب میرے دن پھرنے لگے تو ہر رکاوٹ خود بخود دور ہونے لگی۔ بہت جلد اسے شکاگو اور نارتھ ویسٹرن ریلوے کمپنی کا اٹارنی بنا دیا گیا۔ اور اس کی آمدنی میں بہت اضافہ ہو گیا۔ پھر ایک زبردست ہنگامہ ہوا۔ ہڑتال نفرت، دنگا فساد، خون خرابہ۔

ڈیرو کی ہمدردیاں ہڑتالیوں کے ساتھ تھیں۔ جب ریلوے یونین کے صدر یوگین ڈیبز پر مقدمہ چلایا گیا تو ڈیرو نے ملازمت چھوڑ دی۔ اور محکمے کی قانونی پیروی کرنے کی بجائے ہڑتالیوں کے وکیل کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوا۔ یہ ڈیرو کا سنسنی خیز مقدمہ تھا۔ اس کے بعد اس نے کئی ایسے زبردست مقدمے لڑے کہ جن کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔

مثال کے طور پر لیوپولڈ اور لوب کا مشہور مقدمہ لیجیے۔ یہ دونوں ایک بے گناہ شخص بوبی فرلینکس کے قاتل تھے۔ لوگ اس سفاکانہ قتل پر اس قدر برافروختہ تھے کہ جب کلیرنس ڈیرو نے دونوں قاتلوں کی پیروی کرنے کی ذمہ داری سنبھالی تو اس پر نفرت اور حقارت کے پتھر پھینکے گئے۔ اور مجرم کا لقب دیا گیا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟۔ ڈیرو کہتا ہے ''میں نے یہ مقدمہ اس لئے لیا ہے تاکہ میں ان ملزموں کو نفرت کی لہر سے بچا سکوں۔ آج تک میرا کوئی موکل سولی پر نہیں چڑھا اور اگر کبھی ایسا ہوتا تو میں شاید اپنی جان لے لیتا۔ میں آج تک کسی مجرم کے تختہ دار پر لٹکنے کی داستان تک پڑھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اگر میرے شہر میں کبھی کسی کو پھانسی ملنا ہوتی تو میں شہر سے باہر چلا جاتا۔ میں کسی بھی شکل میں کسی کی جان لینے کے حق میں نہیں۔'' معاشرہ مجرموں کو جنم دیتا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا۔ اور کوئی بھی شخص کسی بھی وقت مجرم بن سکتا ہے۔

ڈیرو کو خود بھی اس بات کا تجربہ تھا، کہ مقدمہ بازی کتنی بڑی لعنت ہے۔ ایک بار اس پر جیوری کو رشوت دینے کا مقدمہ چلایا گیا۔ اور اسے اپنی صفائی کے لئے اپنی قانونی ذہانت اور جسارت کا سہارا لینا پڑا۔ اس مقدمے کے دوران میں ڈیرو کو ایسے

الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا کہ اسے زندگی بھر یاد رہا۔ اس کا ایک پرانا موکل اسے ملا اور کہنے لگا بات یہ ہے کہ ایک بار آپ نے مجھے سزائے موت سے بچایا تھا۔ اب آپ مصیبت میں ہیں۔ اور میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ایک اشارہ کریں تو میں اس مقدمے میں آپ کے خلاف سب سے بڑے گواہ کو ہلاک کرنے کو تیار ہوں۔ اور اس کے لئے آپ کو ایک سینٹ بھی خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔

چند سال پہلے ڈیرو نے ایک کتاب شائع کی۔ جس میں اس کی اپنی زندگی کی کہانی ہے۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ

میں اس کتاب کے ایک باب کے مطالعے کے لئے رات بھر جاگتا رہا۔ اس باب میں ڈیرو نے بتایا تھا کہ زندگی کے بارے میں اس کے نظریات کیا ہیں؟۔

لکھا تھا۔۔۔۔ میں پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے زندگی میں واقعی کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے۔ میں نے غلطیاں بھی کی ہیں۔ اور تقدیر کے مضبوط ہاتھوں سے اپنے لئے زیادہ سے زیادہ مسرتیں چھیننے کی کوشش بھی کی ہے۔ ہمیں زندگی کے سفر کا رخ اور انجام پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اور اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ہماری زندگی کا ہر دن اپنی جگہ مکمل ہو۔ مجھے یہ یقین نہیں آتا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تو میں نے دنیا کے سامنے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت میرے پاس اپنا سفر کرنے کے لئے بہت سارا وقت تھا۔ اب سفر ختم ہونے کے قریب ہے۔ اور سورج غروب ہو رہا ہے۔ آغاز سفر کے وقت راستہ کتنا طویل دکھائی دیتا تھا۔ اور اب یہ کتنا مختصر معلوم ہوتا ہے۔

اینڈ کارنیگی

وہ کروڑ پتی تھا مگر اکثر کہا کرتا تھا کہ دولت مند مرنا ایک ذلت سے کم نہیں

اینڈ ریو کارنیگی کے والدین اس قدر غریب تھے کہ اس کی پیدائش کے وقت نہ تو کسی ڈاکٹر کو بلایا گیا اور نہ ہی کسی دایہ کو۔ جب روزی کمانے کا وقت آیا تو وہ ایک پینی فی گھنٹہ کے حساب سے ملازم ہو گیا۔ اس نے 800,000000 کروڑ پونڈ کمائے۔

ایک دفعہ مجھے سکاٹ لینڈ میں وہ مکان دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ وہ مکان فقط دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اس کا باپ نچلے کمرے میں کھڈی کا کام کرتا تھا۔ اور بالائی کمرے میں گھر کے افراد کھانا وغیرہ پکاتے اور وہیں سوتے تھے۔

جب اینڈ ریو کارنیگی کا کنبہ امریکہ میں آیا تو اینڈ ریو کا باپ میز پوش بناتا تھا۔ اور انہیں فروخت کرنے کے لئے گھر گھر پھرتا تھا۔ اس کی والدہ دوسروں کے گھروں میں کپڑے دھوتی اور ایک موچی کے ہاں جوتوں کی سلائی کرتی تھی۔ اینڈ ریو کے پاس فقط ایک قمیض ہوتی تھی۔ جب وہ رات کو بستر میں گھس جاتا تو اس کی والدہ ہر رات وہ قمیض دھو کر استری کرتی تھی۔ وہ ہر رات سولہ سے اٹھارہ گھنٹے کام کرتی تھی۔

اسے اپنی ماں سے بے حد محبت تھی۔ جب وہ بائیس برس کا تھا تو اس نے اپنی والدہ

سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے جیتے جی ہرگز شادی نہیں کرے گا۔ وہ اپنے وعدے کا پورا نکلا۔ اس وعدے کے تیس برس بعد اس کی والدہ نے وفات پائی۔ باون برس کی عمر میں اس نے شادی کی۔ اور باسٹھ سال کی عمر میں اس کے ہاں پہلا اور اکلوتا بچہ پیدا ہوا۔

جب وہ لڑکا تھا تو اکثر اپنی والدہ سے کہا کرتا تھا ''ماں میں ایک دن امیر ہو جاؤں گا پھر تمہیں ریشمی لباس اور ایک گاڑی خرید دوں گا۔'' وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اسے ذہانت اپنی والدہ سے ورثہ میں ملی ہے۔ اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز اس سے بے پناہ اور غیر فانی محبت ہے۔ وہ جب فوت ہوئی تو پندرہ برس تک اس کا نام اپنے لبوں پر لانے کی جرات نہ ہوئی۔ اس نے سکاٹ لینڈ میں ایک عورت کا قرضہ محض اس لئے چکا دیا تھا کہ اس کی شکل اس کی والدہ سے ملتی تھی۔

اینڈریو کارنیگی ''لوہے کے بادشاہ کے نام سے مشہور تھا۔'' اس کے باوجود وہ لوہے کی صنعت کے متعلق بہت کم واقفیت رکھتا تھا۔ اس کے تحت ہزاروں لوگ کام کرتے تھے۔ اور وہ اس کی نسبت زیادہ علم اور تجربہ رکھتے تھے۔ لیکن اسے آدمیوں سے کام لینا آتا تھا۔ اور اس بات نے اسے امیر بنا دیا تھا۔ زندگی کے ابتدائی دور میں ہی اس کے اندر لوگوں کی قیادت کرنے، انہیں منظم کرنے اور ان سے کام لینے کی جھلک موجود تھی۔

جب وہ سکاٹ لینڈ میں رہتا تھا۔ تو کہیں سے خرگوشوں کا ایک جوڑا پکڑ لایا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد گھر کے اندر خرگوش ہی خرگوش دکھائی دینے لگے۔ ان سب

کے لئے غذا مہیا کرنا ایک مسئلہ تھا۔ اسے ایک شاندار خیال سوجھا۔ اس نے محلے کے لڑکوں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ اگر وہ کھانا وغیرہ لائیں گے تو وہ ان کے نام پر خرگوشوں کے نام رکھ دے گا۔ اس ترکیب نے جادو کی طرح کام کیا۔ اور خرگوشوں کے لئے کھانے کی بھرمار ہو گئی۔

کئی برس بعد اینڈریو کارنیگی یہی نفسیات کاروبار میں بروئے کار لایا۔ مثلاً وہ پنسلوینیا ریلوے کمپنی کے پاس لوہے کی پٹریاں فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اینڈریو کارنیگی نے پٹس میں لوہے کا ایک بڑا کارخانہ قائم کیا۔ اور اس کا نام "جے ایڈگر تھامسن سٹیل ورکس" رکھ دیا۔ پینسل وینیا ریلوے کمپنی کا مالک جے ایڈگر تھامسن خوش ہو گیا، اور اسے اپنے نام پر قائم کارخانے کو لوہے کی پٹریاں تیار کرنے کا آرڈر دینے میں کسی قسم کا اعتراض نہ تھا۔

جب اینڈریو کارنیگی نوعمر تھا۔ تو اسے روزی کمانے کی خاطر ایک تار گھر میں بطور قاصد لڑکا کام کرنا پڑا۔ اس کی تنخواہ دو شلنگ یومیہ تھا۔ اور اس کے لئے کافی تھی۔ وہ ان دنوں پٹس برگ میں نیا نیا آیا تھا۔ اور دل میں ڈرتا تھا کہ اگر اس نے کسی دن کسی غلط گھر میں تار بھجوایا تو اسے نوکری سے جواب مل جائے۔ لہذا اس نے شہر کے تمام بڑے بڑے لوگوں کے نام اور پتے ازبر یاد کر لیے۔ وہ آپریٹر بننا چاہتا تھا۔ لہذا وہ رات کے وقت ٹیلی گرافی کا مطالعہ کرنے لگا۔ اور ہر روز صبح سویرے دفتر کے لوگوں کے آنے سے پہلے ٹیلی گرافی کی مشق کرنے لگتا۔

ایک صبح عملے کے آنے سے پہلے تاروں پر گرما گرم خبریں آ رہی تھیں۔ فلاڈلفیا

پٹس برگ سے گفتگو کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ لیکن اس وقت ڈیوٹی پر کوئی آپریٹر نہ تھا۔ لہذا اینڈریو نے تمام پیغام خود نوٹ کیے اور پھر انہیں منزل مقصود تک پہنچا دیا۔ جب افسر کو معلوم ہوا تو اس نے کارنیگی کی فوری ترقی کر دی۔ وہ آپریٹر بن گیا۔ اور اس کی تنخواہ دوگنی ہو گئی۔ لیکن اس کی سیماب صفت صلاحیتیں دوسروں کی نظروں کا مرکز بنی رہیں۔ جب پینسل وینیا ریلوے کمپنی نے ٹیلی گراف کا اپنا نظام قائم کیا تو اینڈریو کارنیگی وہاں آپریٹر کی حیثیت سے چلا گیا وہاں وہ بعد میں پرائیویٹ سیکرٹری اور پھر ترقی کر کے ڈویژنل سپرٹنڈنٹ بن گیا

اچانک ایک دن ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ جس نے اس کی قسمت کو چار چاند لگا دیے۔ ایک دفعہ وہ ریل میں سفر کر رہا تھا۔ کہ ایک موجد بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس موجد نے اسے ٹرین میں سونے کے لیے مخصوص طرز کے نئے ڈبے کا ڈیزائن دکھایا، اس سے پہلے سونے کے ڈبے بڑے بے ہنگم اور بے آرام ہوتے تھے۔ اینڈریو کارنیگی بڑا دوررس انسان تھا۔ اس نے یک دم بھانپ لیا کہ یہ ایجاد بڑی مقبول ہو گی۔ لہذا اس نے قرض لے کر ڈبے بنانے کا کارخانہ کھول دیا۔ اس سے اسے سنسنی خیز منافع ہوا۔ جب اینڈریو پچیس برس کا تھا تو اس اکیلے کی آمدنی ایک ہزار پونڈ تھی۔

ایک دفعہ ریلوے لائن پر لکڑی کا بنا ہوا پل جل گیا۔ جس سے کئی روز تک ریلوں کی آمدورفت بند رہی۔ ان دنوں اینڈریو کارنیگی ڈویژنل سپرٹنڈنٹ تھا۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ لکڑی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب لوہے کا زمانہ ہے۔ لہذا اس

نے روپے قرض لے کر لوہے کے پل تعمیر کرنا شروع کر دیئے۔ اور اتنا نفع کمایا کہ اعداد و شمار سن کر عقل گم ہو جاتی ہے۔

جولاہے کا یہ بیٹا جس چیز کو ہاتھ لگاتا، وہی سونا بن جاتی۔ قسمت اس کی یاوری کر رہی تھی۔ اس نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر مغربی پینسلوینیا میں تیل کے ذخیروں کے درمیان آٹھ ہزار پونڈ میں ایک فارم خریدا۔ اور ایک برس بعد اسے دو لاکھ پونڈ میں فروخت کر دیا۔ ستائیس برس کی عمر میں اس کی ہفتہ وار آمدنی دو سو پونڈ ہو گئی۔ فقط پندرہ برس پہلے وہ دس پنس یومیہ پر کام کرتا تھا۔

وہ 1862ء کا سال تھا۔ ابراہام لنکن امریکہ کا صدر تھا۔ خانہ جنگی زوروں پر تھی۔ اشیاء کی قیمتیں روز بروز بڑھ رہی تھیں۔ بڑی بڑی باتیں ظہور میں آ رہی تھیں۔ امریکہ کی سرحدیں وسیع ہو رہی تھیں۔ تھوڑے عرصے میں ریلوے لائن سارے امریکہ میں بچھ جاتی تھی۔ شہر جنم لے رہے تھے۔ امریکہ ایک انقلابی اور حیرت ناک دور میں داخل ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اور اینڈریو کارنیگی لوہے کی بدولت دن رات سونا پیدا کر رہا تھا۔ اس کی بھٹیاں لوہے کو کندن بنا رہی تھیں۔ جس قدر سرعت سے وہ امیر ہوا۔ انسانی تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ کسی شخص نے کبھی اتنی جلدی ترقی نہیں کی۔

اس کے باوجود اس نے کبھی محنت شاقہ نہیں کی تھی۔ وہ اپنا نصف وقت تفریح میں بسر کرتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس کے نائب اس سے زیادہ کام کو سمجھتے ہیں۔ وہ تو فقط انہیں کام کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اگرچہ وہ سکاچ تھا۔ مگر تنگ نظر اور بخیل نہیں

تھا۔ وہ دوسرے لوگوں کو اپنے کاروبار میں شریک کرتا تھا۔ اس کی بدولت بہت سے لوگ لکھ پتی بنے۔

اس نے اپنی زندگی بھر فقط چار برس تعلیم حاصل کی۔ اس کے باوجود اس نے آٹھ کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں اقتصادیات، سوانح عمری، مضامین اور سفرناموں پر مشتمل تھیں۔ اس نے پبلک لائبریریوں کو ایک کروڑ بیس لاکھ اور تعلیم کی ترقی کے لئے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ دیے۔

اسے روبی برنز کی تمام نظمیں ازبر تھیں اس طرح شکسپیئر کے ڈرامے ''میکبتھ'' ''ہملٹ'' اور ''کنگ لیر، رومیو جولیٹ'' اور وینس کا سوداگر اسے زبانی یاد تھے۔ وہ جب چاہتا انہیں دہرا سکتا تھا۔

وہ چرچ کا رکن نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے ساڑھے سات کروڑ پونڈ دوسروں کی امداد کے لئے دیے۔ یعنی ایک سال میں ہر روز بیس لاکھ پونڈ۔ اس نے اخبارات میں اعلان کرا رکھا تھا کہ جو شخص اسے اس کی دولت کا بہترین مصرف بتائے گا۔ وہ اسے انعام دے گا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ دولت مند ہونا ایک ذلت سے کم نہیں۔



جے پیرپونٹ مورگاں

وہ پرانے کپڑے پہن کے بارش میں گھومنے کا شوقین تھا

آپ کے خیال میں دنیا میں اپنے وقت کا سب سے زبردست آدمی کون گزرا ہے؟۔ بلاشبہ خیال اپنا اپنا، پسند اپنی اپنی۔لیکن ایک بات بالکل سچ ہے کہ روپے کی دنیا میں سب سے زبردست آدمی جے پیرپونٹ مورگاں، وال سٹریٹ کا آمر اور سٹاکس اور باونڈز کی دنیا کا شہنشاہ تھا۔

لیکن اس کے باوجود بطور ایک فرد کے وہ بالکل غیر معروف تھا۔اگر میں اسے پر اسرار بھی کہوں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔وہ پبلسٹی یا ذاتی شہرت سے بہت گھبراتا تھا۔اسے تصویریں کھینچوانے تک سے تو خوف آتا تھا۔

جب وہ غصے میں آتا تو آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔وہ اس قدر صاف گو تھا کہ اسے امریکہ کا سب سے زیادہ کھرا آدمی کہا جاتا تھا۔

چھ فٹ لمبا اور دو سو پونڈ وزن کا یہ جسیم شخص کبھی خوف زدہ یا ہراساں نہیں ہوا تھا۔ مثال کے طور پر ایک روز ایک خبطی آدمی دیوار پھلانگ کر اس کے گھر داخل ہو گیا۔ اس نے بندوق کی نالی جے پیرپونٹ مورگاں کی طرف موڑی اور اسے دھمکی دی کہ وہ اسے قتل کر دے گا۔مورگاں چاہتا تو اسے چکمہ دے کر ایک قریبی دروازے سے فرار ہو جاتا۔لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ وہ سیدھا بندوق کی طرف بڑھتا گیا۔

اگلے ثانیے میں ایک دھماکہ ہوا۔ مورگاں لڑکھڑایا، گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ اس نے ہمت نہ ہاری، اور آگے بڑھتا گیا۔ وہ پاگل آدمی پر جھپٹا اور اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اسے سٹریچر پر ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا۔ وہ موت سے بال بال بچ گیا تھا۔

اس کے بعد کسی عام آدمی کے لئے ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ 23 وال سٹریٹ میں سونے کے اس بادشاہ تک رسائی حاصل کر سکے۔ وہ پراسرار دفتر جو گوشے کے نام سے مشہور تھا۔ تاریخی مقامات کی سیر کرانے والے گائیڈ آج بھی سیاحوں کو اس عمارت کے سامنے والے حصے پر گولیوں کے نشانات دکھانا نہیں بھولتے۔ یہ نشانات 1916ء کی اس تباہی کی یادگار ہیں۔ جس میں چالیس افراد ہلاک اور دو سو زخمی ہوئے تھے۔ اور جس سے 400,000 پونڈ کی جائیداد کو نقصان پہنچا تھا۔

یہ حادثہ دوپہر بارہ بجے ہوا تھا۔ لوگ ہنستے کھیلتے دفتروں سے نکل رہے تھے۔ اور کسی کو یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ مورگاں کے دفتر کے باہر ایک پرانی بگھی کس مقصد کے لئے کھڑی ہے۔ یکا یک زبردست روشنی ہوئی، پھر ایک خوفناک دھماکہ جس سے بڑی بڑی عمارتیں ہل گئیں۔ ایک بم پھٹا، جس میں سو پونڈ ٹی این ٹی تھی۔ گلی میں موت کا جشن شروع ہو گیا۔

ہزاروں کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو کر فٹ پاتھ پر جا گرے۔ بارہ منزلہ عمارت میں شعلے بھڑکنے لگے۔

فٹ پاتھ سے تیس فٹ کی اونچائی پر کھڑکیوں سے ہاتھ پاؤں حتیٰ کہ کھوپڑیاں

نیچے گر رہی تھیں۔

چیختے چلاتے خون میں لتھڑے انسان ادھر ادھر بھاگتے ہوئے موت کا شکار بن رہے تھے۔

آگ بجھانے والے انجنوں کی گھنٹیوں اور ایمبولینس کے شوروں نے اس تباہی کو اور خوف ناک بنا دیا تھا۔

جب تباہی ختم ہوئی تو اس گھوڑا گاڑی میں سے جس میں بم لایا گیا تھا۔ صرف پہیے کا ایک حصہ، گھوڑے کے پاؤں کے دو نعل اور کچھ پرزے باقی رہ گئے تھے۔

لیکن مورگاں جس کے لئے یہ سارا کھیل کھیلا گیا تھا۔ اس وقت یورپ میں تھا۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ مجرموں کو پکڑ کر دم لے گا۔ خواہ اس کے لئے اسے کتنی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔

اس کام کے لئے 10,000 پونڈ کا انعام رکھا گیا، پولیس، فیڈرل ایجنٹوں، خفیہ پولیس اور پرائیویٹ سراغ رسانوں نے اتنے بڑے پیمانے پر چھان بین کا سلسلہ شروع کیا۔ جس کی مثال دنیا میں بہت کم ملتی ہے۔ دنیا کا کونا کونا چھانا گیا۔ باہر جانے والے بحری جہازوں کی تلاشی لی گئی۔ اس طرح کینڈا اور میکسیکو کی سرحدوں کی چھان بین ہوئی، نیویارک، شکاگو اور دوسرے شہروں کا چپہ چپہ دیکھا گیا۔ اس تگ و دو میں شاہی خزانے جتنی دولت برباد ہوئی، لیکن پھر بھی ساری کوشش بے سود ثابت ہوئیں۔ آج اس واقعہ کو تیس برس ہو چکے ہیں۔ لیکن راز ابھی تک راز ہے۔

اس واقعہ کے بعد دو مسلح سراغ رسانوں کو مورگاں کے دفتر کے باہر نگرانی پر

مامور کیا۔ اور نچلی عمارت کی چھت کو فولادی موٹی تہوں سے ڈھانپ دیا گیا۔ تاکہ آس پاس سے بم پھینک کر اسے نقصان نہ پہنچایا جا سکے۔

اس فولادی عمارت کے اندر سب سے محفوظ کمرے میں سکولوں کی طرح آگے پیچھے قطار میں دو میزیں بچھی ہوئی ہیں۔۔ اور ان کے پیچھے فرم کا سربراہ مورگاں بیٹھا ہوتا تھا۔ جیسے کوئی استاد جماعت کی نگرانی کر رہا ہو۔

دنیا کی تاریخ میں آج تک کسی اور بنک نے مورگاں کی طرح قوم کے مالی امور میں اتنی اہم خدمات انجام نہیں دیں۔ یہاں تک کہ میڈکس آف فلارنس یا روتھ چائلڈز کو بھی اتنی نیک نامی نصیب نہیں ہوئی، روتھ چائلڈز نے یورپ کو نپولین کی یلغار سے بچایا تھا۔ لیکن مورگاں بنک نے وہ مالی استحکام دیا کہ جس سے اتحادیوں کو پہلی جنگ عظیم میں فتح نصیب ہوئی۔

1915ء میں مورگاں اینڈ کمپنی نے اتنی بڑی مالیت کے غیر ملکی قرضے جاری کیے۔ جس کا کبھی تصور نہ کیا گیا تھا۔ اس طرح جنگ میں اپنے ملک کی مدد کرنے کے لئے ایک ارب پاونڈ سمندر پار بھیجے۔ مورگاں کمپنی نے امریکہ میں اتحادی فوجیوں کے لئے ضروری اشیاء کی فراہمی کا ٹھیکہ لے لیا۔ انہیں اربوں اور کھربوں پونڈ کی مالیت کے ہتھیار اور دوسری ضروری اشیا خرید کر دیں۔

جے پی مورگاں کو لندن بھی اتنا ہی عزیز تھا جتنا کہ نیو یارک، اپنے باپ کی زندگی میں کئی برس تک وہ لندن میں مورگاں کمپنی کی شاخ کا سربراہ رہا تھا۔ اور جب وہ وال سٹریٹ نیو یارک واپس گیا تو اس نے وہاں سہ پہر کی چائے کا انگریزی

طریقہ رائج کیا۔

اپنی موت سے پہلے 1943ء میں اس نے گراس ویر ہسکویر میں ایک شاندار مکان بنوایا تھا۔ وہ اپنے گھر میں نوکروں کی فوج اور خوراک کا ذخیرہ رکھتا تھا۔ تاکہ وہ کسی وقت بھی گھر آجائے خواہ مہینوں کی غیر حاضری کے بعد۔۔ تو کھانے کی میز کو تیار پائے۔ آتش دانوں میں آگ جل رہی ہو۔ اور چارپائی پر بستر لگا ہو۔

مسٹر مورگاں کی شہرہ آفاق لائبریری میں اس وقت اس قسم کے ہزاروں نایاب مسودے ہیں، جو کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے سے پانچ سو برس پہلے کے ہیں۔ اس کے شیکسپیئر کے قلمی نسخے اور گٹن برگ بائبل کی ایک جلد بھی تھی۔ اس ایک کتاب کی قیمت غالباً 40,000 پونڈ تھی۔

جے پی مورگاں کے متعلق مشہور تھا کہ وہ شیکسپیئر اور بائبل سے پوری واقفیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے میری اور آپ کی طرح جاسوسی ادب سے بہت دلچسپی تھی۔

اپنے باپ کی طرح جو مورگاں لاثانی کے لقب سے مشہور تھا۔ وہ بھی آرٹ کا بہت قدردان تھا۔ اس نے تصویروں، مجسموں، اور ہیرے، جواہرات پہ بے حد دولت صرف کی۔ اور جب اس نے بعض اپنی نادر تصویریں فروخت کیں تو اخباروں نے اس خبر کو نہایت جلی عنوانات سے شائع کیا۔

ہر کرسمس کے موقعہ پر مورگاں لائبریری میں ایک عجیب وغریب رسم ادا کی جاتی تھی۔ بیٹے، پوتے اور بعض بے تکلف دوست ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے، اور سکورج

کی کہانی سنتے ۔ یہ کہانی چھپی ہوئی کتاب سے نہیں ، بلکہ ڈکنز کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے سے پڑھ کر سنائی جاتی۔

اتنی امارت کے باوجود مورگاں کی بیشتر تفریحات بہت سادہ تھیں ۔مثال کے طور پر اسے اس بات کا بہت شوق تھا کہ وہ بارش میں پرانا ہیٹ اور کوٹ پہن کر بازار میں پھرے۔

اسے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔اس کی وفات کے بعد اس نے اس کا کمرہ جوں کا توں رکھا۔یہ عورت اس عجیب وغریب بیماری کا شکار ہوئی تھی جو خواب آور مرض کہلاتا ہے۔اور مورگاں کی اتنی دولت اسے موت کی آغوش سے نہ بچا سکی تھی۔

اس کی بیوی کو پھولوں سے عشق تھا۔اور وہ ایک ایسے کلب کی ممبر تھی جس کے ارکان اپنے ہاتھوں سے باغ بانی کرتے تھے۔اور جے پی مورگاں بھی جو دنیا کے امیر ترین آدمیوں میں سے تھا۔بیوی کی موت کے بعد پرانے کپڑے پہن کر باغ کی کیاریاں درست کیا کرتا تھا۔



ڈورس ڈیوک

اس کے والد نے 20,000,000 پونڈ کمائے مگر اسے ایک معمولی بات سمجھتا تھا۔

دنیا کی امیر ترین لڑکی زندگی سے زیادہ خوش نہیں۔ اس کی ازدواجی زندگی بڑی تلخ تھی، اس سبب شادی سے تھوڑے عرصے بعد وہ اپنے شوہر سے الگ ہو گئی۔ اسے اکثر بے چاری امیر لڑکی کہا جاتا تھا۔ کیونکہ جہاں کہیں بھی وہ جاتی۔ اخباروں کے نمائندے اور کیمرہ مین سائے کی طرح اس کا پیچھا کرتے ہیں، جب کبھی بازار میں اس نے کوئی چیز خریدنے جانا ہوتا ہے۔ اس کے ہمراہ اس کا حفاظتی دستہ ہوتا ہے۔

اس کی بہت ساری جاگیریں ہیں۔ چار امریکہ میں اور ایک فرنچ رومیرا کے کنارے پر۔ نیو جرسی میں پانچ ہزار ایکٹر پر مشتمل اس کا فارم خوبصورتی کے لحاظ سے تمام فارموں سے سبقت لے گیا ہے۔

اس کے باوجود اپنی شادی سے ایک ہفتہ پہلے جب وہ پام بیچ پر نہا رہی تھی۔ تو اس نے تین سال پرانا نہانے والا لباس پہن رکھا تھا۔ اتنی ساری دولت کے باوجود اس نے اپنی شادی کی رسم ایک چھوٹے سے مکان میں آگ کے الاؤ کے سامنے نہایت سادہ انداز میں ادا کی۔ ڈورس ڈیوک اتنی بڑی جائیداد کی مالک کیسے بن گئی۔ یہ سب دولت دھوئیں سے بنی ہے۔ سگریٹ کے دھوئیں سے۔

ڈورس ڈیوک کے لکھ پتی ہونے کی داستان خانہ جنگی کے اختتام سے شروع ہوتی ہے۔ جنوبی امریکہ کے لئے وہ دن بڑے تلخ تھے۔ فوجوں نے کھیت ویران کر دیئے تھے۔ لوگ بے حد تکلیف میں تھے۔ اور چائے اور کافی کے بدلے اخروٹ، کپاس کے بیج اور رس بھری کے پتے ابال کر پیتے تھے۔ ڈورس ڈیوک کا دادا، واشنگٹن ڈیوک، جنرل لی کی قیادت میں لڑا۔ اسے قید میں سخت تکالیف اٹھانی پڑی تھی۔ جب لی نے ہتھیار ڈال دیئے تو وہ ورہام "نارتھ کیرونیا" واپس چلا آیا۔ ویران کھیتوں میں فقط ایک فصل کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ تھی تمباکو کی فصل، واشنگٹن ڈیوک نے تمباکو کی فصل کاٹی، اسے خشک کیا، گاڑی میں لادا اور اپنے دو بے ماں کے بچوں کے ہمراہ دنیا کو فتح کرنے چل پڑا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے تمباکو کی دنیا فتح کر لی۔ اور تمباکو کی ایک ایسی سلطنت قائم کی، جس کی حدود میں ساری دنیا آ گئی۔

وہ تمباکو سے بھری ہوئی گاڑی لے کر ریاست کے جنوبی حصے کی طرف چل پڑے۔ جہاں تمباکو کی کمی تھی۔ وہاں انھوں نے لوگوں سے تمباکو کے بدلے گوشت اور کپاس لی۔ رات کے وقت انھوں نے سڑک کے کنارے ڈیرہ ڈال لیا۔ گوشت اور آلو بھون کر کھائے اور ستاروں کی چھاؤں میں سو گئے۔ اس زندگی میں انہیں بڑا مزہ آیا۔ لہذا انھوں نے تمباکو کی فروخت کو اپنا پیشہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھیں تمباکو کی منڈی میں سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑا۔ سینکڑوں امیر کمپنیاں پائپ کا تمباکو پہلے سے بنا رہی تھیں۔ جیمز بھکانی ڈیوک ڈورس، ڈیوک کا باپ جانتا تھا کہ تمباکو کی مارکیٹ پر قبضہ جمانے کے لئے

اسے فوری طور پر کوئی نیا اقدام کرنا ہوگا۔ ورنہ وہ بھوکے مریں گے۔ آخر اسے ایک ایسا خیال سوجھا جس کے ذریعے انہوں نے 20,000,000 پونڈ کمائے۔ اس نے سگرٹ بنانے کا فیصلہ کیا۔ ممکن ہے آج یہ خیال اتنا منفرد دکھائی نہ دے۔ جب کہ امریکی ہر سال ایک سو پچیس ارب سگرٹ پیتے ہیں۔ لیکن 1881ء میں یہ بات نئی تھی۔ روسی اور ترک کئی برس سے سگرٹ پی رہے تھے۔ اور جنگ کریمان سے واپسی پر برطانوی اپنے ہمراہ سگرٹ لائے تھے۔ لیکن امریکہ جہاں پہلے پہل تمباکو کی کاشت ہوئی تھی۔ 1867ء تک سگرٹ سے ناآشنا تھا۔

جب بک ڈیوک نے سگرٹ بنانے شروع کیے تو اس زمانے میں سگرٹ ہاتھ سے بنائے جاتے تھے۔ اس نے ایک ایسی مشین ایجاد کی جو ایک دن میں اڑھائی ہزار کی بجائے دس لاکھ سگرٹ بنانے لگی تھی۔ سگریٹ کی پہلی ڈبیا کا ڈیزائن بھی اسی نے تیار کیا تھا۔

اس ایک نئی بات سے اسے اپنے کاروبار میں بے حد کامیابی حاصل ہوئی۔ جب حکومت نے تمباکو پر سے ٹیکس کم کر دیا تو بک ڈیوک نے سگرٹوں کی قیمت کم کر کے اپنے حریفوں کو پریشان کر دیا۔

پھر اس نے تمباکو کی نئی منڈیاں تلاش کرنی شروع کر دیں، جب وہ نیویارک میں سگرٹوں کی نئی فیکٹری قائم کرنے کے لئے آیا تو اس کی عمر فقط ستائیس سال تھی۔ وہ اپنے آپ کا مخاطب کر کے اکثر کہا کرتا تھا۔ اگر ''جون، ڈی راک فیلر'' ''تیل کا بادشاہ'' کہلا سکتا ہے تو میں ''تمباکو کا بادشاہ'' کیوں نہیں کہلا سکتا۔ لہذا اس نے اپنے

منافع کاروبار میں لگا دیا۔ جب وہ ایک سال میں دس ہزار پونڈ کما رہا تھا، اس زمانے میں بھی وہ زیادہ سے زیادہ روپیہ کاروبار میں لگانے کے لئے کم خرچ کرتا اور ایک سستے ہوٹل میں رہتا۔ اس کے ایجنٹ دنیا کے دور دراز علاقوں میں جا رہے تھے۔

وہ صبح سے رات گئے تک اپنی فیکٹری میں کام کرتا، اور سارے کام کی نگرانی خود کرتا۔

جب وہ مرا تو 20,000,000 پونڈ چھوڑ گیا تھا۔ وہ اس بات پر فخر کیا کرتا تھا کہ اس نے امریکہ میں سب سے زیادہ لاکھ پتی بنائے ہیں۔ وہ فقط چار پانچ برس سکول گیا۔ ایک دفعہ اس نے کہا تھا "کالج کی تعلیم" مبلغوں اور وکیلوں کے لئے ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے اس سے کیا فائدہ پہنچنا تھا؟۔ کاروبار میں اعلیٰ دماغ کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

وہ اپنی ترقی کی وضاحت اس طرح کرتا تھا کہ "میں کاروبار میں اس لئے کامیاب نہیں ہوا کہ دوسروں کی نسبت مجھ میں کاروباری صلاحیت زیادہ ہے۔ بلکہ میں نے فقط زیادہ محنت کی ہے۔ میں نے اپنے سے زیادہ صلاحیتوں کے مالک لوگوں کو کاروبار میں ناکام ہوتے دیکھا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ان میں قوت ارادی نہیں ہوتی"۔

یہ عجیب بات ہے کہ یہ شخص جسے تعلیم کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے ایک یونیورسٹی کے قیام کے لئے 80,000 پونڈ دیئے۔ اس یونیورسٹی کا ڈیوک یونیورسٹی ہے۔ اور وہ ڈرہام میں ہے۔ اس کے ٹرسٹ کے ارکان میں ڈورس ڈیوک بھی شامل ہے۔

''بک ڈیوک'' کو شہرت سے نفرت تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں فقط ایک انٹرویو دیا تھا۔ اس انٹرویو میں ایک رپورٹر نے اس سے پوچھا کہ ''مسٹر ڈیوک'' کیا اتنی دولت آپ کے لئے اطمینان قلب کا باعث ہے''۔

بک ڈیوک نے اپنے سر کو جھٹکا دے کر کہا۔ ''نہیں ہرگز نہیں!''



جون ڈی راک فیلر

ایک لڑکی نے صرف اس بنا پر اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا کہ اس کا مستقبل روشن نہ تھا

جون ڈی راک فیلر نے تین حیرت ناک کام کیے ہیں:

پہلا، انسانی تاریخ میں وہ واحد شخص ہے، جس نے ہر منفرد انسان سے زیادہ روپیہ کمایا۔ اس نے زندگی کا آغاز دو پنس فی گھنٹہ کے حساب سے کڑی گرمی میں آلو صاف کرنے سے کیا تھا۔ اس زمانے میں سارے امریکہ میں نصف درجن سے زیادہ ایسے لوگ نہ تھے۔ جن کی ذاتی دولت 200,000 پونڈ سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن جون، ڈی نے اتنی دولت کمائی، جس کا اندازہ 20,000000 پونڈ سے 40,000,000 پونڈ کے درمیان ہے۔

اس کے باوجود زندگی میں پہلے پہل اسے جس لڑکی سے محبت ہوئی۔ اس نے جون، ڈی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر کیوں؟۔ کیوں کہ اس لڑکی کی ماں نے اپنی بیٹی کی شادی ایسے شخص سے کرنے سے انکار کر دیا۔ جو نہایت غریب تھا اور مستقبل میں بھی اس کی آمدنی میں اضافہ ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔

مسٹر جون ڈی راک فیلر نے جو دوسرا حیرت ناک کام کیا وہ یہ ہے کہ اس نے انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ روپیہ دوسروں کی امداد کے لئے دیا۔ یعنی

150,000,000 پونڈ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت یسوع کی پیدائش سے اب تک تین شلنگ فی سیکنڈ کے حساب سے دوسرے الفاظ میں 3500 سو سال پہلے جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لے کر دریا کے پار گئے تھے۔ اس وقت سے اب تک 150 پونڈ فی دن کے حساب سے۔

جون ڈی راک فیلر کے متعلق تیسری حیرت ناک بات یہ ہے کہ وہ ستانوے برس تک زندہ رہا۔ اس کا شمار امریکہ کے ان لوگوں میں سے ہوتا تھا، جن سے عوام سخت نفرت کرتے تھے۔ اسے موت کی دھمکیوں کے ہزاروں خط آتے۔ اس کے مسلح باڈی گارڈ دن رات اس کی حفاظت کرتے۔ اس کا کاروبار بے حد وسیع تھا۔ اس کا تنظیمی بوجھ وہ اپنے اعصاب پر برداشت کرتا تھا۔

امریکہ میں ریلوے کے معمار ہاری بار کو اس کے کام کے بوجھ نے 61 برس کی عمر میں ہلاک کر دیا تھا۔

وول ورتھ نے پانچ اور دس سینٹ والی اشیاء کی دکانوں کا وسیع سلسلہ قائم کیا۔ اور اس کی تگ و دو میں وہ 67 برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بک ڈیوک نے تمباکو کے کاروبار سے 20,000,000 پونڈ کمائے اور 68 برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

لیکن جون ڈی راک فیلر نے ہاری مان، وول ورتھ اور بک ڈیوک کی مشترکہ دولت سے زیادہ روپیہ کمایا۔ اور یاد رہے کہ دس لاکھ انگریزوں میں سے فقط تین انگریز ستانوے برس کی عمر کو پہنچتے ہیں۔ اور میرے خیال میں دس کروڑ سفید آدمیوں میں

سے ایک بھی ایسا نہ ہوگا جو مصنوعی دانتوں کے بغیر ستانوے برس کی عمر کو پہنچا ہوگا۔

اس کی طویل زندگی کا راز کیا تھا؟۔شاید اسے زیادہ عرصہ زندہ رہنے کا رجحان وراثت میں ملا تھا۔ اور اس رجحان کو پرسکون اور ٹھنڈے مزاج نے تقویت پہنچائی، وہ کبھی غصے میں نہ آیا تھا۔

جب وہ سٹینڈرڈ آئل کمپنی کا انچارج تھا۔تو اس نے دفتر میں ایک صوفہ بچھا رکھا تھا۔حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں، وہ دوپہر کو نصف گھنٹہ ضرور آرام کرلیا کرتا تھا ۔اپنی موت کے وقت تک وہ چوبیس گھنٹوں میں پانچ دفعہ ضرور آرام کیا کرتا تھا۔

جب جون ڈی راک فیلر پچپن برس کا تھا تو اس کی صحت بے حد خراب ہو گئی، طب کی دنیا میں یہ ایک نہایت خوشگوار واقعہ تھا کہ اپنی بیماری سے متاثر ہوکر جون ڈی راک فیلر نے طبی تحقیق کے لئے لاکھوں پونڈ دینے شروع کر دیئے۔اس کی بیماری کے سبب راک فیلر فونڈیشن ساری دنیا میں 200,000 پونڈ ماہوار خرچ کر رہی ہے۔

1932ء میں میں خوفناک ہیضے کی وبا کے دوران میں چین میں تھا۔ اس افلاس زدہ اور بیماریوں سے گھرے ہوئے ماحول میں پیکنگ گیا اور وہاں راک فیلر فونڈیشن سے ہیضے کا ٹیکہ لگوایا۔اس سے پہلے مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا تھا کہ راک فیلر فونڈیشن ایشیا کے غریب لوگوں اور دنیا کے دور افتادہ علاقوں کے لئے کیا خدمات انجام دے رہا ہے۔راک فیلر فونڈیشن دنیا سے بیماری کا خاتمہ کرنے کی مہم میں بڑے خلوص سے مصروف ہے۔ملیریا کے خلاف اس ادارے نے اپنی جنگ جیت لی ہے۔

اس کے ڈاکٹر "زرد بخار" کے خلاف اپنی مہم میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

جون، ڈی نے اپنی کمائی کا پہلا شلنگ فیل مرغوں کو پالنے کے لئے اپنی والدہ کی مدد کر کے کمایا تھا۔ اس وقت سے اپنی موت تک اس نے آٹھ ہزار ایکڑ پر مشتمل اپنی جاگیر میں بہترین فیل مرغ پال رکھے ہیں۔

فیل مرغ کی دیکھ بھال کے سلسلے میں اس کی والدہ اسے جو پیسے دیتی۔ وہ انہیں حفاظت سے رکھ چھوڑتا، پھر اس نے ایک فارم میں ایک پنس چھ شلنگ یومیہ مزدوری پر کام کرنا شروع کیا۔ اور اس طرح اس نے دس پونڈ جمع کر لیے۔ یہ دس پونڈ اس نے ایک شخص کو سات فی صد شرح سود پر قرض دے دیئے۔ اور اس نے حساب کر کے اندازہ لگایا کہ ان دس پونڈ سے ایک سال میں اسے اتنا سود حاصل ہوگا کہ جو دس دن کی کڑی محنت کی مزدوری کے برابر ہوگا۔

اس نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ روپے کا غلام بننے کی بجائے روپے کو اپنا غلام بنائے گا۔

جون، ڈی نے یونہی بے سوچے سمجھے اپنے بیٹے کو روپیہ دے کر خراب نہیں کیا تھا۔ مثلاً اس نے اپنے لڑکے سے کہہ رکھا تھا کہ اس کی جاگیر کے گرداگرد جتنی تار لگی ہوئی ہے۔ وہ جہاں جہاں سے خراب ہے، اسے دیکھے اور ہر خراب جگہ دریافت کرنے پر اسے نصف پنشن کی شرح سے پیسے ملیں گے۔ ایک دن میں وہ ایسی تیرہ مرمت طلب جگہیں ڈھونڈ لیتا۔ اور اس طرح اسے ہر روز چھ پنس مل جاتے۔ پھر جون، ڈی راک فیلر تار کی مرمت کے لئے اپنے بیٹے کو ساڑھے سات پنس فی گھنٹہ

کے حساب سے مزدوری دیتا۔ اور اس کی والدہ اسے واشنگ سنانے پر اڑھائی پنس فی گھنٹہ کے حساب سے دیتی۔

جون، ڈی کبھی کالج نہ گیا تھا۔ ہائی سکول کی تعلیم کے بعد وہ چند ماہ کے لئے ایک تجارتی سکول میں داخل ہو گیا۔ سولہ برس کی عمر تک وہ تعلیم سے فراغت حاصل کر چکا تھا۔ اس کے باوجود اس نے شکاگو یونیورسٹی کو 10,000,00 پونڈ دیئے،

اسے مذہب میں ہمیشہ دلچسپی رہی تھی۔ جوانی کے دنوں میں وہ اتوار کے اتوار چرچ میں لڑکوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ اس نے کبھی رقص نہ کیا تھا۔ کبھی تاش نہ کھیلی تھی۔ کبھی تھیٹر نہ گیا تھا۔

وہ سونے سے پہلے ہر روز دعا مانگتا اور ہر روز بائبل پڑھتا تھا۔ عوام کی بہبود کے سلسلے میں وہ کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔

راک فیلر کی دولت میں بیس پونڈ فی سیکنڈ کے حساب سے اضافہ ہو رہا۔۔ لیکن راک فیلر کی سب سے بڑی یہ خواہش تھی کہ وہ پورے سو سال زندہ رہے۔

وہ کہا کرتا تھا کہ اگر وہ 8 جولائی 1636ء کو اپنی صد سالہ سالگرہ تک زندہ رہا تو وہ اپنی جاگیر پر بہترین بینڈ کا انتظام کرائے گا۔ اور بینڈ بجانے والوں سے یہ گیت بجانے کے لئے کہے گا۔

"میگی جب تم اور میں جوان تھے۔"

☆☆☆

من چلے لوگ

ریمنڈ ڈٹمارس

وہ سانپ جمع کرتا اور ان کی تجارت کرتا۔

جب ''بش ماسٹر'' ایک قسم کا سانپ نیویارک پہنچا تو اسے دیکھنے کے لئے ہزاروں لوگ چڑیا گھر کے سامنے جمع تھے۔ وہ ابھی چھ ماہ کا بچہ تھا۔ لیکن وہ ایک آتش فشاں پہاڑ سے کم دکھائی نہیں دیتا تھا۔

نیویارک کے چڑیا گھر کا انچارج ریمنڈ ڈٹمارس گزشتہ پچیس برس سے ایک بش ماسٹر کی تلاش میں تھا۔ آخر بڑی جدوجہد کے بعد اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ بش ماسٹر کو کس طرح کھلائے پلائے گا۔ تو اس نے جواب دیا۔ ''یہ تو بڑی آسان بات ہے'' اس کا منہ کھول کر اس میں گوشت ڈال دیں اور پھر ایک چھڑی سے وہ گوشت اس کے حلق سے نیچے کر دیں۔''

ریمنڈ ڈٹمارس سانپوں کے متعلق وسیع علم رکھتا تھا۔ اسے ہزاروں سانپوں سے واسطہ رہا۔ لیکن آج تک کسی سانپ نے اسے کاٹا نہیں۔ اس نے سانپوں کے زہر کی ایک بے مثال دوا بھی بنا رکھی تھی۔ یہ دوا بنانے میں اس نے کئی سال صرف کیے۔ اور اب تک اس سے ہزاروں لوگوں کی زندگیاں بچ گئی ہیں۔

بچپن میں ریمنڈ ڈٹمارس کے والد نے اسے ایک فوجی سکول میں داخل کرایا تھا۔ تا کہ وہ وہاں ویسٹ پوائنٹ ملٹری اکیڈمی میں داخلہ لینے کی تیاری کر سکے۔ اس کا

والد اسے ایک سپاہی کی وردی میں دیکھنا چاہتا تھا۔لیکن ریمنڈ ڈتمارس کے خون میں تو جنگل کی لگن رچی بسی تھی ۔لڑکپن کے جوش وخروش میں اس نے سانپ جمع کرنے کا فیصلہ کیا۔تھوڑے ہی عرصے میں اس کے پاس مختلف نسلوں کے بہت سے سانپ جمع ہو گئے ۔وہ چھٹی کا دن دریائے ہڈسن کے کنارے سانپوں کی تلاش میں بسر کرتا ۔اس نے سانپ خریدے،ان کی تجارت کی،اور دوسروں سے ملتجی لہجے میں مانگے بھی ۔اس نے ویسٹ انڈیز کے سائنس دانوں کو خط لکھے ۔اور ان سے امریکی سانپوں کا تبادلہ کیا۔

آخراس کے پاس سانپوں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا کہ اس کی والدہ نے ڈر کے مارے اسے مکان کا بالائی کمرہ دے دیا ۔جب اخباروں کو اس کے متعلق یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے اس کے متعلق بڑی دل چسپ کہانیاں لکھیں ۔سانپوں کے جوگی اور سرکس کے آدمی اس سے ملنے آئے ۔سارے محلے میں اس کا مکان ایک ہنگامے کا مرکز بن گیا۔

سانپوں کو خوراک مہیا کرنے کے لئے اس نے سٹینوگرافی سیکھنا شروع کردی۔ اس کا والد ڈکنز کے ناول بلند آواز میں پڑھتا،اور وہ شارٹ ہینڈ کی مشق کرتا رہتا۔ اب اس کے پاس شارٹ ہینڈ میں لکھے ہوئے ڈکنز کے ناولوں کا پورا ایک سیٹ موجود ہے۔جسے وہ بے حد عزیز رکھتا ہے۔

بعد میں جب وہ ایک اخبار میں بطور رپورٹر کام کرنے لگا۔تو وہ چائنہ ٹاؤن کے ہوٹلوں کے تہہ خانوں میں چوہے پکڑنے کے لئے پنجرے وغیرہ لگا چھوڑتا،اور اس

طرح اپنے عجیب ذخیرے کے لئے خوراک کا بندوبست کرتا۔

جب نیویارک شہر میں ایک بڑا چڑیا گھر بننے کا فیصلہ ہوا تو سانپوں کے شعبے کے انچارج کے طور پر ریمنڈ ڈٹمارس کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جب وہ اپنا خطرناک ذخیرہ گھر سے اٹھا کر چڑیا گھر میں لے گیا تو اس کی والدہ نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

یہ 1899ء کی بات ہے۔ اس وقت سے اب تک نیویارک کے چڑیا گھر میں دنیا کے عجیب وغریب جانور اور پرندے جمع ہو چکے ہیں۔ ریمنڈ ڈٹمارس کو سانپوں کے متعلق دنیا میں ایک اتھارٹی تصور کیا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی شخص سانپوں کے بارے میں معلومات نہیں رکھتا۔

آپ کے خیال میں بندر کس قدر مسخرے ہوتے ہوں گے؟۔ یہ حقیقت ابھی آپ پر منکشف ہو جاتی ہے۔ چند برس پہلے کی بات ہے کہ ڈاکٹر ریمنڈ ڈٹمارس نے اپنے گھر میں چند بندر رکھے ہوئے تھے۔ ایک دن جب گھر کے افراد کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ تو بندروں نے پنجرہ توڑ کر اعلیٰ پیانے پر جشن منایا۔ ایک روشن دان کے ذریعے وہ کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور چھت سے آویزاں برقی شمع دان کے ساتھ جھولا جھولنے لگے۔ وہ بڑی دیر تک من مانی کاروائیاں کرتے رہے۔ بندروں کے بوجھ سے برقی شمع دان کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ چھت سے ٹوٹ کر زمین پر گرنے والا ہو گیا۔ بجلی کے کئی تار بھی ٹوٹ گئے مگر یہ حیرت کی بات ہے کہ مکان کو آگ نہ لگی۔ وہ پیانوں کے اوپر چڑھ گئے اور جوتوں کا ایک جوڑا لے کر پیانو کے

سروں پر مارنے لگے۔انہوں نے چینی کے برتن توڑ دیئے۔سارے غالیچے پر سیاہی بکھیر دی اور فیس کریم شیشے پر مل دی۔پھر انہوں نے سلائی مشین کے دراز سے دھاگے کا ایک گولہ نکالا، اور اسے سارے مکان کے گرد لپیٹ دیا۔انھوں نے میزوں کے دراز اوپر نیچے کر دیے اور کچن میں سے فرائی پان اٹھا کر اسے سیڑھیوں میں رکھ آئے۔جب اہل خانہ واپس آئے تو گھر کی حالت دیکھ کر انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے ان کے بعد زوروں کی آندھی چلی ہو۔

اب آپ کو اندازہ ہو گا کہ بندر کس قدر مسخرے ہوتے ہیں

☆☆☆

مارٹن جانسن

''کھانا پکا لو گے'' ان تین لفظوں نے اسے دنیا بھر کی سیر کرا دی۔

مارٹن جانسن نے افریقہ کے جنگلوں میں ہزاروں شیروں کی تصویریں اتاریں، لیکن وہ ان میں سے صرف دو کو ہلاک کر سکا۔ مارٹن جانسن نے مجھے بتایا کہ افریقہ کے جنگلوں میں اس کا آخری قیام بیس ماہ کا تھا۔ اس عرصے میں اس نے جتنے شیر دیکھے، اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ اس کے باوجود اس نے ایک بار بھی بندوق نہیں چلائی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے پاس بندوق رکھتا ہی نہیں تھا۔

افریقہ سے واپسی پر ہر سیاح جنگلی جانوروں سے مقابلے کی خونین داستانیں سناتا ہے۔ لیکن جانسن کا اعتقاد یہ تھا کہ وہ یا کوئی بھی ایسا شخص جو افریقہ کے جنگلی جانوروں کے بارے میں مکمل واقفیت رکھتا ہو، کسی ہتھیار کے بغیر صرف بید کی ایک چھڑی کے سہارے جنگل کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ سکتا ہے۔

جانسن نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جب وہ آخری بار افریقہ گیا تو اپنے ساتھ ایک ریڈیو سیٹ بھی لے گیا۔ تاکہ وہاں بیٹھ کر امریکہ سے نشر ہونے والے پروگرام بھی سن سکے۔ اس نے بتایا کہ پہلے ایک دو ماہ تک تو وہ متواتر ریڈیو پروگرام سنتا رہا۔ لیکن بعد میں خشک پروگرام اور کاروباری اعلانات سن سن کر وہ اتنا اکتا گیا کہ اس نے کئی ماہ تک ریڈیو کو ہاتھ نہ لگایا۔

مارٹن جانسن نے صرف چودہ سال کی عمر میں دنیا کی سیاحت شروع کر دی تھی۔ اس کا باپ امریکہ کے مشہور شہر کیناس میں جوہری کا کام کرتا تھا۔ بچپن میں مارٹن جانسن اپنے باپ کی دکان پر دور دراز ملکوں سے آنے والی بند پیٹیاں کھولا کرتا تھا۔ پیٹیوں پر پیرس، جینوا، بارسلونا اور بڈاپسٹ جیسے عجیب و غریب شہروں اور ملکوں کے نام دیکھ دیکھ کر اس کے دل میں یہ خواہش مچلنے لگی کہ وہ دنیا کا سفر کرے۔" آہستہ آہستہ اس خواہش نے مصمم ارادے کی شکل اختیار کر لی اور پھر ایک روز مارٹن جانسن اپنے گھر سے بھاگ نکلا، اور امریکہ سے نکل کر ایک مال بردار کشتی میں سوار ہو کر یورپ روانہ ہو گیا۔ اس "پرانی دنیا" میں پہنچ کر اسے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کئی پاپڑ بیلنا پڑے۔ اکثر اوقات جب اسے کوئی کام نہ ملتا تو خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ برسلز میں اسے کئی روز بھوکا رہنا پڑا۔ برسٹ میں وہ گھر سے دور سمندر کے کنارے انتہائی پریشانی کے عالم میں خلاؤں میں اپنی منزل تلاش کرتا رہا۔ لندن میں اس نے کئی راتیں دکان داروں کے بند کھوکھوں کے نیچے گزاریں، پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس نے مایوس ہو کر واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ اور اپنے وطن جانے کے لئے ایک مجرم کی طرح وہ کئی روز تک ایک بحری جہاز میں چھپا رہا۔

پھر ایک واقعہ ایسا ہوا کہ جس نے اس کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ یہی واقعہ سیاحت کے شوق کی تکمیل کا باعث بنا۔ ہوا یہ کہ جس بحری جہاز میں مارٹن جانسن نے اپنے وطن واپس جانے کے لئے پناہ لی تھی۔ وہاں اس کی ملاقات ایک انجینئر سے ہوئی۔ اس انجینئر نے کسی رسالے میں جیک لندن کا اہم مضمون دکھایا، جیک

لنڈن نے اپنے اس مضمون میں بتایا تھا کہ وہ کس طرح ایک تیس فٹ کے چھوٹے جہاز میں جس کا نام سنارک تھا، دنیا کا سفر کرنا چاہتا ہے۔

گھر پہنچتے ہی مارٹن جانسن نے جیک لنڈن کو ایک خط لکھا۔ آٹھ صفحے کے اس خط میں اس نے اپنی آرزوں اور مسرتوں کی پوری کہانی لکھ دی۔ اس نے انتہائی عاجزی اور انکساری کے ساتھ جیک لنڈن سے التجا کی کہ وہ دنیا کے سفر میں اسے بھی ساتھ لے جائے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ میں خود بھی کئی شہروں کی سیاحت کر چکا ہوں۔ میں جب شکاگو سے اس سفر پر روانہ ہوا تو میری جیب میں تیس ڈالر تھے۔ اور جب میں واپس اپنے گھر پہنچا تو میری جیب میں ایک ڈالر باقی تھا۔

دو ہفتے گزر گئے، لیکن خط کا کوئی جواب نہ آیا۔ پھر ایک دن اسے جیک لنڈن کی طرف سے ایک تار ملا۔ یہ تار صرف تین الفاظ پر مشتمل تھا۔ تین الفاظ جنہوں نے مارٹن جانسن کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ لکھا تھا "کھانا پکا لو گے۔"

کیا وہ کھانا پکانا جانتا تھا؟۔ بالکل نہیں، اس کے لئے تو چاول پکانا بھی مشکل تھے۔ اس نے جیک لنڈن کی طرح اختصار سے تین ہی لفظوں کا جوابی تار بھیجا "مجھے آزما لیجیے۔" اس کے بعد وہ گھر سے نکلا اور ایک ہوٹل کے باورچی خانے میں ملازم ہو گیا۔

اور آخر کار جب جیک لنڈن کا چھوٹا جہاز سنارک خلیج سان فرانسسکو کی لہروں کو چیرتا ہوا بحر الکاہل کی طرف روانہ ہوا تو مارٹن جانسن ہیڈ باورچی کی حیثیت سے اس میں سوار تھا۔ ہوٹل کی ملازمت کے دوران اس نے اتنی مہارت پیدا کر لی تھی کہ وہ اب روٹی، آملیٹ، شوربہ حتیٰ کہ پڈنگ تک آسانی سے پکا سکتا تھا۔ سودا سلف

خریدنے کا کام بھی اس کے سپرد تھا۔ اس نے احتیاطاً نمک مرچ کی اتنی مقدار خرید لی تھی کہ جو ایک عام سفر کے لئے دو سو سال تک کافی تھی۔

اس سفر میں اس نے جہاز رانی بھی سیکھی، بہت جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک بہترین جہاز ران ہے۔ چنانچہ ایک روز اس نے اپنی ذہانت کا مظاہرہ کرنے کے لئے نقشے میں یہ دکھانے کی کوشش کی کہ ان کا جہاز اس وقت کس مقام سے گزر رہا ہے۔ اس وقت سنارک بحر الکاہل میں سے گزرتا ہوا ہونولولو کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن مارٹن جانسن کا محدود علم یہ بتاتا تھا کہ اس وقت جہاز بحر اوقیانوس کے وسط میں ہے۔

لیکن یہ جان کر کہ اس کا اندازہ اور حساب صحیح نہیں۔ اس نے حوصلہ نہ ہارا۔ اس کا جوش و خروش روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اب دنیا کی کوئی چیز اسے اپنے ارادوں سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ ایک دفعہ جہاز کا ملاح جہاز کو چھوڑ کر دو ہفتے کے لئے غائب ہو گیا اور مارٹن جانسن کو کوئی دو ہفتے کڑی دھوپ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔

اس واقعہ کو تیس سال ہو چکے ہیں۔ مسرت و انبساط کے تیس سال جس میں مارٹن جانسن سیاحت کا شوق پورا کر چکا ہے۔ اس دوران میں اس نے سات سمندروں کی سیر کی ہے۔ پوری دنیا کا چکر لگایا ہے۔ اور کورال کے جزیروں سے افریقہ کے تاریک جنگلوں تک کا کونہ کونہ چھان مارا ہے۔ آدم خور جانوروں کی جو تصویریں آج امریکہ میں دکھائی جاتی ہیں۔ وہ سب سے پہلے مارٹن جانسن نے ہی اتاری تھیں۔ اب تک وہ شیروں، چیتوں، ریچھوں، زرافوں اور افریقہ کے دوسرے جنگلی جانوروں کی ہزاروں تصویریں لے چکا ہے۔ اس کے تصویروں کے مجموعے میں

عجیب وغریب جانوروں اور انسانوں کی تصویریں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ تصویروں کا مجموعہ نہیں، حضرت نوحؑ کی کشتی ہے۔ جس میں طرح طرح کی مخلوق سوار ہے۔ اس نے فنا ہو جانے والے جنگلی جانوروں کو اپنی شان دار عکاسی سے اس خوب صورتی کے ساتھ سلولائیڈ پر منتقل کیا ہے۔ کہ ہماری آنے والی نسلیں اس دور میں بھی ان جنگلی جانوروں کے نظارے سے لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔ جب غالباً افریقہ کے بہت سے جانوروں کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا۔

مارٹن جانسن کا کہنا ہے کہ ایسا شیر جسے انسان نے کبھی نہ ستایا ہو، کسی حالت میں بھی انسان پر وار نہیں کرتا۔ جنگل میں ایک جگہ کوئی دس پندرہ شیر لیٹے ہوئے تھے۔ مارٹن جانسن نے اپنی کار ان کے درمیان جا کھڑی کی۔ شیروں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ اور پالتو بلیوں کی طرح زمین پر کروٹ لیتے رہے۔ ان میں سے ایک شیر اپنی جگہ سے اٹھا اور کار کے اگلے ٹائر کو چومنے لگا۔ اس طرح ایک بار مارٹن جانسن اپنی کار ایک شیرنی کے اس قدر قریب لے گیا کہ وہ اگر چاہتی تو بڑی آسانی سے اس کے کوٹ کو چھو سکتی تھی۔ لیکن اس نے ایسا کرنے کی تکلیف گوارہ نہ کی۔

میں نے اس سے پوچھا ”کیا تم یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو کہ شیر بہت اچھی فطرت کا مالک ہے۔“

اس نے جواب دیا نہیں بھائی نہیں! میرا یہ قطعی مطلب نہیں۔ میرے نزدیک خود کشی کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ انسان شیر کو بے ضرر سمجھنے لگے۔ کیونکہ تم کبھی یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ کس وقت اسے تمہاری نیت پر شبہ ہو جائے اور وہ تم پر وار کر

دے۔اور شیر جب غصے میں آیا ہوا ہو تو دنیا تمام چیزوں سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے ۔اس کا وار بالکل یونہی ہوتا ہے کہ جیسے کوئی سو پونڈ کا ڈائنامائیٹ پھینک رہا ہو۔شیر کی ایک چھلانگ تقریباً چالیس فٹ کی ہوتی ہے۔اور غصے کی حالت میں وہ انتہائی تیز رفتار گھوڑے کو بھی پیچھے چھوڑ سکتا ہے۔

میں نے اس سے سوال کیا کہ کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ کسی مصیبت کی لپیٹ میں آ کر مرتے مرتے بچا ہو۔"اس نے جواب دیا ایسے کئی واقعات ہیں۔" لیکن اب میرے لئے وہ کھیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

اس قسم کا ایک حادثہ اس جزائر غرب الہند میں پیش آیا۔اگر قسمت اس کی مدد نہ کرتی تو اس روز آدمی خوروں کی دیگ میں اس کا قورمہ بن جاتا۔اس روز وہ آدم خور کی پہلی تصویر اتار رہا تھا۔اس سے پہلے کسی نے ایسی تصویر نہیں اتاری تھی۔سفید فام تاجر ان دنوں آدم خوروں کے جزیروں پر یلغار کر رہے تھے۔ان کا کام یہ تھا۔وہ حبشی لوگوں کو اغوا کرتے اور غلاموں کی حیثیت سے فروخت کر دیتے۔آدم خور ایک تو ان کی ان حرکات پر برافروختہ تھے۔اور ہر سفید فام کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔دوسرے انہیں ہر دم شکار کی تلاش رہتی تھی۔اب تک وہ کئی سفید فام لوگوں کو ہلاک کر کے ان کا سامان لوٹ چکے تھے۔جب مارٹن جانسن ان کے ہتھے چڑھا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ کینسا س کے اس نوجوان کا قورمہ بہت لذیذ رہے گا۔چنانچہ مارٹن جانسن ان کے سردار سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہوا اسے تحائف پیش کر رہا تھا۔تو بہت سے آدم خوروں نے اسے چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے لیا۔یہاں مارٹن جانسن

کی مدد کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ جب اس نے اپنے گردوپیش دیکھا تو اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اس کے پاس پستول تو تھا۔ لیکن آدم خور سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ اور ایک پستول ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ کرے اور سردار سے باتیں جاری رکھے۔ آدم خوروں کی تعداد میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور وہ اپنے نیزے ہوا میں اچھال اچھال کر خوشی کے گیت گا رہے تھے۔ اس موقع پر مارٹن جانسن کو پہلی بار خیال آیا کہ اس نے اپنا گھر بار چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اگر وہ اپنے باپ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے کاروبار سنبھال لیتا تو زیادہ مناسب تھا۔

اور پھر جب آدم خور اس کی طرف لپکنے ہی والے تھے تو ایک معجزہ رونما ہوا۔ یکایک نیچے خلیج سے ایک برطانوی گشتی جہاز کی وسل سنائی دی۔ آدم خور پریشان ہو گئے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس وسل کا کیا مطلب ہے؟۔ یہ وسل سن کر مارٹن جانسن بھی حیران رہ گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے آدم خوروں کے سردار کو فرشی سلام کرتے ہوئے کہا "دیکھا آپ نے میرا جہاز میری تلاش میں یہاں آن پہنچا ہے۔" آپ لوگوں سے مل کر بہت مسرت ہوئی، خدا حافظ! اور اس سے پہلے کہ کوئی آدم خور اس کی طرف بڑھتا۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ خلیج کی طرف بھاگ گیا۔

☆☆☆

ڈائمنڈ جم براڈلے

مرنے سے پہلے وہ اپنی ساری دولت خیرات کر گیا کیونکہ وہ اپنے پیچھے کسی قسم کی دردسر نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔

ڈائمنڈ جم براڈلے، براڈوے کا ہارون الرشید، پہلی جنگ عظیم کے دوران فوت ہوا تھا۔اس کی موت نے براڈوے کا ایک عظیم شخصیت سے محروم کر دیا۔اپنی زندگی میں ڈائمنڈ جم براڈلے اتنی عظیم الشان دعوتیں دیا کرتا تھا، کہ انہیں دیکھ کر رومن سلطنت کی عظیم الشان ضیافتیں یاد آ جاتی تھیں۔بعض اوقات وہ نیویارک میں ایک ہی اوقات میں مختلف پانچ جگہوں پر دعوتیں دیا کرتا تھا۔کئی دفعہ یوں بھی ہوا کہ یہ دعوتیں سترہ سترہ گھنٹے مسلسل جاری رہیں۔اور ان پر اس کا 20,000 پونڈ خرچ اٹھ جاتا تھا۔جاتی دفعہ وہ اپنے مہمانوں کو طلائی گھڑیاں اور جواہرات کے تحفے دیتا۔ان میں سے بعض طلائی گھڑیوں کی قیمت □ 200 پونڈ ہوتی۔

ڈائمنڈ جم براڈلے نیویارک میں ساحل سمندر پر ایک دکان کے اوپر ایک چھوٹے سے خستہ حال چوبارے میں پیدا ہوا۔اس کا باپ ایک شراب خانہ چلاتا تھا۔ڈائمنڈ جم براڈلے نے ابھی بولنا بھی نہ سیکھا تھا کہ اسے شراب کی بوتل میں سے کارک نکالنا آ گیا۔اس کے باوجود اس نے کبھی زندگی میں شراب کو منہ نہیں لگایا۔

جن دنوں براڈوے میں اس کا راج تھا۔اس نے شراب کی اتنی بوتلیں خریدیں کہ

شاید کوئی اس کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن یہ سب کچھ وہ اپنے دوستوں کے لئے کرتا۔ جب اس کے دوست شراب پینے میں محو ہوتے تو وہ بڑے شوق سے کہا کرتا۔ ایک ہی وقت میں بیئر کی دس بارہ بوتلیں پی جانا اس کے نزدیک معمولی بات تھی۔

اس کا وزن پونے تین سو پونڈ کے قریب تھا۔ کھانے کا وہ بے حد شوقین تھا۔ ہر رات اس کی میز پر پندرہ مختلف قسم کے کھانے ہوتے۔ اور وہ ان سب کو چٹ کر جاتا۔ پھر وہ ایک پونڈ چاکلیٹ کھاتا اور تھیٹر جاتے وقت پیپر منٹ کا ڈبہ اپنے ساتھ لے جاتا۔ وہ ہر ہفتے اپنے احباب کو مٹھائیوں کے سیکڑوں ڈبے بھیجتا۔ اس کا فقط مٹھائی وغیرہ کا ماہوار بل چار سو اور چھ سو پونڈ کے درمیان ہوتا تھا۔ اسے چائے اور کافی سے نفرت تھی۔ لیکن مالٹوں کے رس کا بے حد دلدادہ تھا۔ وہ کھانے سے پیشتر مالٹوں کے رس کے چار گلاس پیتا تھا۔ ایک دفعہ وہ بیٹھا بیٹھا چھ مرغ کھا گیا۔ یہ باتیں آپ کو مضحکہ خیز معلوم ہوں گی۔ لیکن بڑھاپے میں جب ایک بیماری کے سبب اس کا آپریشن کیا گیا تو ڈاکٹروں کو معلوم ہوا کہ اس کا معدہ عام معدے سے چھ گنا بڑا تھا۔

ڈائمنڈ جم براڈلے نے لاکھوں روپے کس طرح کمائے؟ ۔وہ اپنے زمانے کا ایک بہترین سیلز مین تھا۔ اس کے علاوہ وہ خوش قسمت بھی تھا۔ زندگی میں ترقی کرنے کا اسے ایک موقع مل گیا۔ جس زمانے میں امریکی گاڑیوں کے ڈبے لکڑی کے بنے ہوتے تھے۔ اس نے لوہے کے بنے ہوئے ڈبے فروخت کرنے شروع کر دیئے۔ ملک ترقی کی راہ پر برق رفتاری سے چل رہا تھا۔ ہر سمت دور دراز علاقوں تک ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھایا جا رہا تھا۔

جب اس نے لوہے کے ڈبے فروخت کرنے شروع کیے تو ان دنوں ایسے ڈبے بطور تجربہ استعمال ہو رہے تھے۔ اسے ایک بہت بڑا ٹھیکہ مل گیا۔ فروخت ہونے والے ہر ڈبے پر اسے 331/2 فی صد کمشن ملنے لگا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں امریکہ کی ہر کمپنی لوہے کے ڈبوں کا مطالبہ کرنے لگی۔ ان سب کو ڈائمنڈ جم براڈلے کے پاس آنا پڑتا۔ کیونکہ اس زمانے میں اس کا مدمقابل کوئی نہیں تھا۔ لہذا اس نے لوہے کے ڈبے فروخت کرکے 25,000,000 پونڈ کمائے۔ وہ اپنے زمانے کی پیداوار تھا۔ اگر وہ چالیس برس بعد پیدا ہوتا، اور آج لوہے کے ڈبے فروخت کرنے کی کوشش کرتا تو گھر کے اخراجات بھی بمشکل چلا سکتا تھا۔

ڈائمنڈ جم براڈلے نے اپنے آپ کو مشہور کرنے کا ایک ایسا انوکھا طریقہ ایجاد کیا جو اپنی مثال آپ تھا۔ وہ ہر وقت ہیرے جواہرات سے لیس رہتا۔ ہر روز وہ جواہرات کا ایک نیا سیٹ استعمال کرتا۔ اور بعض اوقات دن میں چھ سات مرتبہ وہ گھڑی کی زنجیر، قمیض کے بٹن اور سٹڈ وغیرہ تبدیل کرتا۔ جب وہ براڈوے میں داخل ہوتا تو اس کی قمیض میں اڑھائی سو سے زیادہ ہیرے جڑے ہوتے۔ اس کی قمیض کے بٹن گراں قدر ہوتے، ان سٹڈوں پر سائیکلوں، موٹروں اور انجنوں وغیرہ کا ڈیزائن بنا ہوتا۔

روپیہ خرچ کرنے کے سلسلے میں وہ وہم و گمان کی حد تک فراخ دل واقع ہوا تھا۔ نیو جرسی میں اس کا ایک فارم تھا۔ جہاں دعوتوں وغیرہ کے موقعوں پر بھینسوں اور گائیوں کی دودھ سونے کے برتنوں میں دھویا جاتا تھا۔ اس کے بلیرڈ ٹیبل پر لوہے کی

بجائے سونا لگا ہوا تھا۔ اور وہ سارے کا سارا ساگوان کا بنا ہوا تھا۔ اس کی تاش کھیلنے والی میز پر ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے گھر کی آرائش کے لئے ایک مصور کو 300,000 پونڈ دیئے۔ وہ ہر سال اپنا پرانا فرنیچر اپنے احباب میں تقسیم کر دیتا اور خود نیا خریدتا تھا۔

اس نے للیَن رسل ایکٹرس کو ایک ایسا سائیکل بطور تحفہ دیا، جس کے پہیئے سونے کے تھے۔ اور سارے سائیکل پر جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ جب اس سائیکل پر سوار ہو کر للیَن ففتھ ایونیو سے گزرتی ہو گی۔ تو آپ خود ہی اندازہ کر لیں لوگوں کا کیا حشر ہوتا ہو گا۔

ڈائمنڈ جم براڈلے کے پاس پانچ ہزار سے اوپر رومال اور دو سو سے زیادہ سوٹ تھے۔ فراک کوٹ اور ریشمی ہیٹ کے بغیر اسے کبھی عوامی محفل میں نہ دیکھا گیا۔ جب وہ کار میں بیٹھ کر یونہی ذرا گھومنے پھرنے کے لئے نکلتا اور اسے دیکھنے والا اس کے کتے کے سوا اور کوئی نہ ہوتا تو پھر بھی اس نے فراک، کوٹ اور ریشمی ہیٹ پہن رکھا ہوتا۔ اور جواہرات سے مزین چھڑی اس کے ہاتھ میں ہوتی۔

ڈائمنڈ جم براڈلے کا معدہ عام معدوں سے چوگنا بڑا تھا۔ تو یہی حالت اس کی وسیع قلبی کی تھی۔ کئی برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ کہ جو کوئی بھی اس سے طلب کرنے آیا، اس نے انکار ہرگز نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ روپیہ ادھار طلب کرنے والے اسے ہرگز رقم واپس نہ کریں گے۔ لیکن پھر بھی اس نے یہ سلسلہ محض تفریح سمجھ کر جاری رکھا۔ کیا آپ اس تفریح کے متحمل ہو سکتے ہیں؟۔

جب اس کے مرنے کا وقت قریب آیا تو اس کے پاس کوئی 40,000 پونڈ کے نوٹ تھے۔ مرنے سے پہلے اس نے وہ تمام نوٹ جلا دیئے۔ اس موقع پر اس نے کہا تھا کہ وہ مرنے کے بعد کسی قسم کی دردِ سر نہیں چھوڑنا چاہتا''۔

مرنے سے پہلے وہ اپنی ساری دولت اور جائیداد خیرات میں دے گیا۔ اس کے ہیرے جواہرات کی قیمت 40,000 پونڈ سے زیادہ تھی۔ جن چیزوں میں وہ جڑے ہوئے تھے۔ انہیں وہاں سے نکال کر انگشتریوں میں لگا کر فروخت کیا گیا۔ آج بھی بہت سی خواتین کے پاس وہ ہیرے جواہرات موجود ہوں گے۔ جو ایک زمانے میں ڈائمنڈ جم براڈلے کی خوب صورتی میں اضافہ کیا کرتے تھے۔

ہر کوئی ''ڈائمنڈ جم براڈلے'' سے محبت کرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ساری عمر کنوارہ رہا۔ للین رسل کی جھولی میں اس نے 20,000 پونڈ ڈال کر اس سے شادی کی درخواست کی مگر اس نے انکار کر دیا۔ ایک دفعہ اس نے کہا تھا کہ ''دنیا بھر میں کوئی ایسی عورت نہ ہوگی جو مجھ جیسے بدصورت آدمی سے شادی کرے۔'' اور وہ میز پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔



ولیم رنڈولف ہرسٹ

اس نے ایک درخت کو اس کی اصل جگہ سے بیس فٹ دور ہٹانے کے لئے 8000 پونڈ خرچ کر دیئے۔

کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ اگر آپ کو بیس ہزار (20000) پونڈ مل جائیں تو آپ انہیں کیسے خرچ کریں گے؟۔ ولیم رنڈولف ہرسٹ کی ماہانہ 200,000 پونڈ تھی۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ روزانہ ساٹھ ہزار پونڈ۔ ذرا اندازہ لگایئے کہ اس کتاب کے ایک باب کے پڑھنے میں آپ جتنا وقت صرف کر رہے ہیں۔ اتنی دیر میں اس کی آمدنی میں تقریباً بیس پونڈ کا اضافہ ہو جاتا تھا۔

ولیم رنڈولف ہرسٹ کو کبھی کسی نے اس کے اصلی نام سے نہیں پکارا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے گہرے دوست بھی اسے ''ڈبلیو آر'' کہتے تھے۔ اور اپنے ستر ہزار ملازموں میں وہ ''سرکار'' کے نام سے مشہور تھا۔

وہ چوبیس اخباروں اور نو رسالوں کا مالک تھا۔ جنہیں کروڑوں لوگ بڑے ذوق شوق سے پڑھتے تھے۔ وہ دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند اور با رسوخ ناشر تھا۔ پورے امریکہ میں ہر لکھا پڑھا شخص اس کے نام سے واقف تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی ذاتی زندگی انتہائی پر اسرار تھی۔ یہاں تک کہ ایک عام آدمی بھی ولیم رنڈولف ہرسٹ کی نسبت مہاتما گاندھی کی ذاتی زندگی کے بارے میں زیادہ کچھ جانتا تھا۔

امریکہ کے اس سب سے بڑے ناشر کے بارے میں مجھے جو بات سب سے زیادہ عجیب محسوس ہوئی، وہ یہ تھی کہ یہ شخص بے حد شرمیلا اور چپ چاپ تھا۔ کوئی پچاس سال اس کے مشہور ترین شخصیات سے تعلقات رہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس بات سے بہت ہچکچاتا تھا کہ اسے اجنبی لوگوں سے متعارف کرایا جائے۔

کیلے فورنیا میں اس کی بہت بڑی جاگیر تھی۔ جہاں ہر وقت کم از کم پچاس ساٹھ مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لیکن اس کا اپنا پسندیدہ مشغلہ یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے تنہائی میں وقت گزارا جائے۔ جب وہ نیویارک میں رہتا تھا۔ تو اسے بس ایک ہی شوق تھا۔ اور وہ یہ کہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر آنے جانے والوں کا نظارہ کرتا رہے۔

مغربی ملکوں میں غالباً سب سے عظیم الشان جاگیر کیلے فورنیا میں ہرسٹ کا مویشی خانہ تھا۔ اس مویشی خانے کا رقبہ کوئی اڑھائی لاکھ ایکڑ تھا۔ اور یہ سمندر کے کنارے پچاس میل تک پھیلا ہوا تھا۔

بحر اوقیانوس کے ساحل پر سطح سمندر سے کوئی دو ہزار فٹ کی بلندی پر اس نے ایک قلعہ نما حویلی بنوا رکھی تھی۔ جس کا نام "جادو کی پہاڑی" تھا۔ اس حویلی کو سجانے کے لئے اس نے لاکھوں پونڈ خرچ کیے تھے۔ اس کی دیواروں پر فرانس کے شاہی محلوں کے خوب صورت پردے آویزاں تھے۔ اور انہی دیواروں پر ریمبراں روبنز اور رافیل جیسے عظیم ترین فن کاروں سے نقش و نگار بنوائے گئے تھے۔ اس کے مہمان ایک بہت بڑے ہال میں کھانا کھاتے تھے۔ جس میں نادر قسم کا ساز و سامان رکھا ہوا

تھا۔ لیکن دوپہر کے کھانے کے وقت ان مہمانوں کو کپڑے کے رومالوں کی جگہ کاغذ کے رومال دیے جاتے تھے۔

اس کے پاس جنگلی جانوروں کی اتنی بڑی فوج تھی کہ دنیا کے مشہور ترین جرمن سرکس بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتے تھے۔ جس پہاڑی پر یہ حویلی تعمیر کی گئی تھی۔ وہاں کئی زرافے، ہیل، کنگرو ادھر ادھر پھرتے رہتے تھے۔ درختوں پر عجیب وغریب قسم کے پرندے چہچہاتے تھے۔ اور اس کے ذاتی چڑیا گھر میں شیر اور چیتے دھاڑتے رہتے تھے۔

میرا ایک دوست فرینک مینس فرانس میں ولیم رنڈولف ہرسٹ کے لئے پرانی اور نادر چیزیں خریدا کرتا تھا۔ ہرسٹ نادر اشیاء کے جہاز کے جہاز خرید لیتا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات پورے قلعہ کا سودا کر لیتا۔ اور انہیں بکسوں میں بند کر کے امریکہ لے آتا۔ ان میں سے ہر اینٹ، پتھر اور لکڑی کے ٹکڑے پر نمبر اور لیبل لگا ہوتا تھا۔ تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کی اصل جگہ کہاں ہے؟۔ اور بعد میں انہیں جوڑ کر ہو بہو ویسی ہی عمارت کھڑی کی جا سکے۔

اس نے فن کے اتنے نمونے خریدے کہ آخر کار اسے ان چیزوں کو رکھنے کے لئے جو زیر استعمال نہ تھیں، نیویارک میں ایک بہت بڑا گودام خریدنا پڑا۔ اس گودام کی دیکھ بھال پر سالانہ بارہ ہزار پونڈ خرچ آتا تھا۔ اور اس میں پرانے گھڑیالوں سے مصر کی حنوط شدہ نعشوں تک سب کچھ تھا۔

ولیم رنڈولف ہرسٹ کا باپ میسوری کے ایک زمیندار خاندان سے تعلق رکھتا تھا

۔1849ء کی جنگ میں اس نے مغربی فوجوں کی سربراہی کی۔لق ودق صحراؤں میں کوئی دو ہزار میل پیدل چلا۔جگہ جگہ مقامی باشندوں سے جنگیں لڑیں،سونے کی کانیں دریافت کیں۔اور کروڑپتی بن گیا۔جب بوڑھا ہوا تو اسے اپنی جاگیر میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھنے رہنے کا بہت شوق تھا۔بعد میں ولیم رنڈولف ہرسٹ نے محسوس کیا کہ اس درخت کی وجہ سے اس کے کمرے کی ایک کھڑکی سے سمندر کے نظارے میں بہت رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس درخت کو کٹوا دے۔جس سے کبھی اس کے باپ دادا کو والہانہ محبت تھی۔چنانچہ اس نے اس درخت کو تیس فٹ کے فاصلے پر منتقل کرنے کے لئے آٹھ ہزار پونڈ ادا کیے۔

وہ جانوروں کا بہت شوقین تھا۔مثال کے طور پر ایک روز فلمسازوں کا ایک گروہ مسٹر ہرسٹ سے تبادلہ خیال کرنے کے لئے ہالی وڈ سے اس کے ہاں آیا،اور انہیں محض اس وجہ سے کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑا کہ وہ اس وقت اپنے ایک زخمی چیتے کی تیمار داری کر رہا تھا۔ایک اور موقع پر اس نے اپنے ایک جانور کے طبی معائنے کے لئے ڈاکٹر کو سو پونڈ فیس ادا کی۔

تقریبا اسی سال کی عمر میں ولیم رنڈولف ہرسٹ ٹینس کا اچھا کھلاڑی بن گیا تھا ۔وہ چالیس سال سے ٹینس کھیل رہا تھا۔لیکن اس کے باوجود اپنے کھیل کو زیادہ بہتر بنانے کے لئے استاد سے برابر ہدایت لیتا تھا۔وہ اچھا شوقیہ فوٹوگرافر بھی تھا۔اور ہر سال ہزاروں تصاویر اتارتا تھا۔اس کا بندوق کا نشانہ اب بھی لاجواب تھا۔ایک روز اس نے گھوڑی پر بیٹھے بیٹھے اپنے دوستوں کے سامنے پستول اپنی ران پر رکھتے

ہوئے ایک اڑتے ہوئے پرندے پر فائر کیا، اور اسے زمین پر گرالیا۔

وہ ایک اچھا مشاق رقاص اور ایک بہترین داستان گو بھی تھا۔ اس کی یادداشت انسائیکلوپیڈیا کی طرح تھی۔ مثال کے طور پر اگر آپ اس سے پوچھتے کہ ہنری ہشتم کی بیویوں کے نام کیا تھے؟۔ اور امریکہ میں کون کون لوگ صدر کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ تو سوچے بغیر ایسے سوالوں کے جواب دے سکتا تھا۔

ایک روز جمی واکر اور چارلی چپلن ہرسٹ کے مویشی خانے کی سیر کر رہے تھے۔ دونوں کے درمیان بائبل کے کے ایک جملے کے اصل الفاظ کے بارے میں بحث چھڑ گئی۔ ہرسٹ نے یہ جملہ لفظ بلفظ دہرا کر اس بات کا فیصلہ کرا دیا۔

اسے اس بات کا بھی شوق تھا کہ اس کے آس پاس ہمیشہ نوجوان لوگ رہیں۔ اس نے اس بات کی سخت ہدایت دے رکھی تھی کہ اس کی موجودگی میں کوئی موت کا ذکر نہ کرے۔

ہرسٹ کو ورثہ میں 6,000,000 پونڈ ملے تھے۔ وہ چاہتا تو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر مزے سے زندگی گزار دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ اس کے برعکس وہ کوئی ساٹھ سال تک روزانہ آٹھ سے پندرہ گھنٹے کام کرتا تھا۔ اس نے یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اس وقت تک کام سے دست بردار نہیں ہوگا جب تک اللہ تعالیٰ کا بلاوا نہ آ جائے۔



کلاؤڈ بیٹی

بیمہ کمپنیوں نے اس کا بیمہ کرنے سے انکار کر دیا۔

شیروں نے کئی بار اپنے دانتوں اور پنجوں سے اس کے جسم کو زخمی کیا۔ کئی بار اسے ایسا لگا کہ شیر کے دانت اس کی ران کی ہڈی میں گڑ گئے ہیں۔ ہاتھیوں نے اسے اپنی سونڈ میں پکڑ کر ہوا میں اچھالا ہے۔ ریچھوں نے اسے چت زمین پر گرایا ہے۔ ایک بار ایک کالے ریچھ نے اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ زمین پر کتنی دیر بے ہوش پڑا رہا۔ کوئی اکیس بار اسے زخمی حالت میں سٹریچر پر ڈال کر لے جایا گیا۔ اور آخری بار جب اس کے سب سے بڑے شیر نیرو نے اسے پچھاڑا تو وہ دس ہفتے ہسپتال پڑا رہا۔ اس کی ایک ٹانگ تقریباً بے کار ہو گئی۔

کلاؤڈ بیٹی کا دھندا، دنیا کے خطرناک پیشوں میں ہے۔ وہ دن میں ایک بار نہیں کم از کم دو بار شیروں کے جبڑے کے اندر جھانکتا ہے۔ بیمہ کمپنیوں کو معلوم ہے کہ وہ کسی وقت بھی کسی درندے کی بھینٹ چڑھ سکتا ہے۔ اس لئے ان میں سے کوئی کمپنی اس کی زندگی کا بیمہ کرنے پر تیار نہ تھی۔ وہ سرکس کا واحد کھلاڑی ہے جو کسی قیمت پر بھی بیمہ کی پالیسی حاصل نہیں کر سکتا۔

کلاؤڈ بیٹی نے مجھے بتایا کہ اس نے کئی بار سوچا ہے کہ یہ دھندا ترک کر دے۔ لیکن پھر اسے یہ خیال آتا ہے کہ پیٹ پالنے کے لئے کوئی نہ کوئی کام تو کرنا ہی پڑے

گا۔ اگر کسی کارخانے میں جمع تفریق کرنا پڑی یا اس قسم کا اور کوئی کام اس کے گلے پڑ گیا تو وہ کوفت میں مر جائے گا۔ اگر مرنا ہی ہے تو کوفت سے مرنے کی بجائے کھیل کود میں کیوں نہ دم دے دیا جائے۔ کلائیڈ بیٹی نے اپنی زندگی کا نصف حصہ سرکس میں گزارا ہے۔ اس کا بچپن چیلی کوتھی (اوہیو) میں گزرا، اور وہ اسی زمانے سے سرکس کا رسیا تھا۔

ایک روز برنم اور بیلی کا سرکس اس شہر میں آیا۔ ایک لانڈری والے نے اپنی دکان کے اندر اس سرکس کا اشتہار لگایا ہوا تھا۔ اور اس رنگین اشتہار میں یہ دکھایا گیا تھا کہ شیروں کو سدھانے والا ایک بہادر افریقی شخص شیروں پر ہنٹر برسا رہا ہے۔ اشتہار پر نظر پڑتے ہی کلائیڈ بیٹی بھاگا بھاگا دکان کے اندر گیا اور لانڈری والے سے التجا کی کہ سرکس کے جانے کے بعد وہ یہ اشتہار اسے دے دے۔ لانڈری والے نے کہا کہ میں تمہیں یہ اشتہار دے دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ تم ایک ہفتہ میرے ساتھ ہاتھ بٹاؤ گے۔'' اس نے یہ شرط قبول کر لی۔

اس وقت اس کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ اور اس عمر بھی میں اس نے بعض جانوروں کو اپنے اشاروں پر نچانے کی مہارت پیدا کر لی تھی۔ کم از کم وہ اس خوش فہمی میں ضرور رہتا تھا۔ اس کے پاس پانچ کتے تھے، جنہیں اس نے اٹھنے بیٹھنے، سلام کرنے، زمین پر لوٹنے، اور دم ہلانے کی تربیت دے رکھی تھی۔ چنانچہ وہ لانڈری والے سے لیا ہوا اشتہار دیوار پر لگا کر اکثر اوقات اپنے ہم جولیوں کے سامنے اپنے کرتب دکھاتا۔ اس کے بعد ہر سال جب بھی اس کے شہر میں سرکس آتی، وہ اس کے

مالک سے جا کر ملازمت کی درخواست کرتا، اور ہر بار اسے یہی جواب ملتا کہ تم ابھی چھوٹے ہو۔ پھر موسم بہار کی ایک صبح کو جب سرکس کا ایک بہت بڑا قافلہ شہر سے باہر نکل رہا تھا، تو بیٹی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس کا دل شدت جذبات سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے پریشان والدین تین روز تک اسے تلاش کرتے رہے۔ جب اس نے ایک خط گھر اپنے والدین کو روانہ کیا۔ کہ وہ ایک سرکس میں پنجرے دھونے پر ملازم ہوگیا ہے۔ تو اس کی ماں یہ پڑھ کر کئی روز روتی رہی۔ اس وقت کلائیڈ بیٹی کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ اسے ماہانہ ایک پونڈ تنخواہ ملتی تھی۔

آئندہ دس سالوں میں چیلی کوتھی، اوہیو کا یہ نوجوان تمام شیر سدھانے والوں کو پیچھے چھوڑ گیا۔ اس نے اس میدان میں اتنی جرات، دلیری اور بعض اوقات اتنی حماقت کا مظاہرہ کیا کہ سرکس کا ہر شخص یہ کہتا تھا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں، اور جب وہ سچ مچ اسے یہ کرتے دیکھ لیتے تو یہ رائے قائم کر لیتے کہ وہ پاگل ہے۔ اور اس کی زندگی انتہائی ارزاں ہے۔ اس نے چالیس خون خوار دہاڑتے ہوئے ببر شیروں اور شیروں کو ایک ہی پنجرے میں بند کر کے خود بھی اس پنجرے میں جا کر ان پر ہنٹر برسانے شروع کر دیئے۔ اس واقعہ نے پورے سرکس میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ دیکھنے اور سننے والے حیران رہ گئے۔ کیونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ببر شیر اور شیر ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی ایک دوسرے پر پل پڑتے ہیں۔ کلائیڈ بیٹی نے کتنی بار ہی اس طرح خون خوار جنگلی درندوں کے پنجرے میں جا کر انہیں اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود، حیرت کی بات یہ ہے کہ کلائیڈ بیٹی کہتا ہے کہ شیر اور ببر شیر اتنے خطرناک نہیں کہ ان پر آسانی سے کنٹرول نہ کیا جا سکے۔ اسے سبھی جانوروں سے پالا پڑا ہے۔ شیر، ببر شیر، چیتا، گینڈا، ہاتھی۔ اس کا تجربہ بتاتا ہے کہ ان سب میں خطرناک ترین جانور ریچھ ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ سب سے مشکل کام شیر کو ہاتھی کی پیٹھ پر سوار کرایا جائے۔ ایک روز ایک ہاتھی نے تو اسے تقریباً ہلاک ہی کر دیا تھا۔ دراصل وہ شیر کے پنجرے کی طرف جا رہا تھا کہ ہاتھی کو شیر کی نفرت انگیز خوشبو آ گئی۔

آپ نے سنا ہی ہو گا کہ جانوروں کو سدھانے والے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان پر قابو پاتے ہیں، لیکن کلائیڈ بیٹی نے مجھے بتایا کہ یہ سب غلط ہے اگر ماویسٹ بھی ایک شیر سے نظریں ملائے تو یہ شیر بھی لمحہ بھر میں اس کی تکہ بوٹی کر دے۔ وہ تو صرف اس وجہ سے اپنے جانوروں کی آنکھوں کی طرف دیکھتا ہے۔ تاکہ یہ اندازہ کر سکے کہ وہ کیا کر رہا ہے، اور آئندہ ثانیے کیا کرنے والا ہے۔

بیٹی کا کہنا ہے کہ کسی تربیت دینے والے نے آج تک کبھی کسی شیر کے منہ میں اپنا سر نہیں دیا۔ ویسے بظاہر دیکھنے میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں بعض ایسے تربیت دینے والے جانوروں کو جانتا ہوں، جو انتہائی نڈر اور دلیر ہیں۔ لیکن میں نے ان میں سے کوئی ایسا بے وقوف نہیں دیکھا کہ جو سچ مچ شیر کے منہ میں اپنا سر دے دے۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ شیروں کو کرتب سکھانے والے خوفناک جانوروں کو قابو میں لانے کے لئے دہکتی آگ سے نکالی ہوئی سرخ سلاخیں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن بیٹی کا کہنا ہے کہ اگر آپ خودکشی کرنا چاہتے ہیں تو آپ ایسے شیر کے پنجرے

میں داخل ہو جائیں جیسے لوہے کی تپتی ہوئی سلاخ سے ضرب پہنچائی گئی ہو۔ اس کے بے ضرر ہتھیاروں میں ایک عام کرسی، ایک چھانٹا اور ایک خالی کارتوس سے بھرا ہوا ایک پستول ہوتا ہے۔

کلاڈ بیٹی کا کہنا ہے کہ اس نے پالتو جانوروں کے ساتھ بھی کام کیا ہے۔ یعنی ایسے جانوروں کے ساتھ جنہوں نے غلامی میں پرورش پائی ہو۔۔۔ لیکن اس نے ان کی نسبت ہمیشہ جنگلی جانوروں کو ترجیح دی ہے۔ پالتو جانور بگڑے ہوئے بچوں کی طرح ہوتے ہیں۔ انہیں اس قدر کاہل اور سست بنا دیا جاتا ہے کہ آخر کار وہ کچھ نہیں کر سکتے۔

اس سے کئی بار یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا شیر ببر شیر کو پچھاڑ سکتا ہے؟ یا کیا ببر شیر شیر کو مات دے سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اس سوال کا جواب نہیں جانتا۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ وہ بڑے پنجرے کے پاس کھڑا ہوا ہے۔ اور اس کے آس پاس شیر اور ببر شیر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ اس نے یہی دیکھا ہے کہ ہمیشہ ببر شیر مل کر لڑتے ہیں۔ لیکن شیر اکیلا مقابلہ کرتا ہے۔ جب ایک ببر شیر لڑنے لگے تو آس پاس جتنے ببر شیر ہوں، سب اس کی مدد کو پہنچ جاتے ہیں۔ خاص طور پر اگر وہ آپس میں بھائی بھائی ہوں تو ایک دوسرے کی مدد میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں کرتے۔ ببر شیر نوجوان لڑکوں کی طرح ہوتے ہیں، ذرا جھگڑا ہو جائے تو وہ سب لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک شیر کو خونی رشتوں کا احساس نہیں ہوتا، اس سے تو یہ بھی بعید نہیں کہ اس کے سامنے اس کا ساتھی مر رہا ہو، اور وہ چبوترے پر بیٹھا ہوا جمائیاں لیتا رہے۔

☆☆☆

ایڈی ریکن بیکر

وہ کاروں کی دوڑ کا مانا ہوا ڈرائیور تھا۔مگر اس کے پاس ڈرائیوری کا لائسنس نہ تھا

یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جسے بظاہر موت نہیں پچھاڑ سکتی۔ جو پچیس برس تک موت اور تباہی کا مذاق اڑاتا رہا۔ اس نے موٹر کاروں کی دو سو سے زیادہ دوڑوں میں تیز رفتاری کے مظاہرے کیے۔ جنہیں دیکھ کر تماشائیوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ 1918ء کے خونیں دور میں اس نے کوئی چھبیس جرمن ہوائی جہازوں کو گولی کا نشانہ بنا کر زمین پر گرا دیا۔ خود اس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی لیکن اسے خراش تک نہ آئی۔

جی ہاں یہ ایڈی ریکن بیکر کی کہانی ہے۔ جس نے پہلی جنگ عظیم میں مشہور امریکی ہوائی سکارڈن "ہیٹ ان دی رنگ" کے کمانڈر کی حیثیت سے بہادری کے ایسے ایسے کارنامے سر انجام دیئے کہ جنہیں دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد میں جس شخص کے منیجر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ میں نے زندگی بھر اس جیسا دل کش آدمی نہیں دیکھا۔ اس شخص کا نام سر راس سمتھ تھا۔ مشہور آسٹریلوی ہوا باز، وہ پہلا شخص جس نے یروشلم کے مقدس شہر پر پرواز کی۔ اور وہ پہلا ہوا باز جس نے پوری دنیا کا چکر لگایا۔ میرے خیال میں دونوں ہوا بازوں کی

عادتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں۔ دونوں خوش گفتار، نرم طبع اور دھیمی طبیعت کے مالک تھے۔ وہ دھاڑتی مشینوں کے پیچھے کھڑے ہونے والے اور آسمان سے آگ برسانے والے دوسرے سپاہیوں کی طرح بددماغ اور سخت مزاج نہ تھے۔

بارہ برس کی عمر تک ایڈی ریکن بیکر ایک آوارہ لڑکا تھا۔ وہ ذرا سی بات پر غصے میں بھڑک اٹھتا تھا۔ اور اڑوس پڑوس کے آوارہ بچوں کا سرغنہ تھا۔ وہ سب کے سب مل کر گلی کوچوں کی بتیاں توڑتے اور لوگوں کے کھیتوں سے گنے اکھاڑتے، پھر ایک المیہ ہوا، اس کا باپ انتقال کر گیا۔ اور رات ہی رات میں ایڈی ریکن بیکر ایک آوارہ کھلنڈرے لڑکے سے ایک ذمہ دار شخص بن گیا۔

جس وقت اس کے باپ کی تجہیز و تکفین ہو رہی تھی۔ ایڈی ریکن بیکر نے تہیہ کیا کہ وہ اپنے پورے کنبہ کا بوجھ اٹھائے گا۔ دوسرے روز اس نے پڑھائی چھوڑ دی اور ایک گلاس فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ اسے فی گھنٹہ دو پنس مزدوری ملتی تھی۔ اور وہ دن میں بارہ گھنٹے کام کرتا تھا۔ اس کے گھر سے فیکٹری کا فاصلہ سات میل تھا۔ وہ روزانہ شام کو پانچ پنس بچانے کے لئے فیکٹری سے گھر اور گھر سے فیکٹری پیدل آتا جاتا تھا۔

اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ آگے بڑھتا جائے گا۔ دنیا کی کوئی شے اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔ گلاس فیکٹری کا کام غیر دلچسپ اور اکتا دینے والا تھا۔ ایڈی کو یہ کام بالکل پسند نہیں تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ فن کار بنے، تخلیق کرے، اور تصورات کی دنیا میں گم ہو کر ایسے نقش و نگار تخلیق کرے کہ جسے دیکھ

کر لوگ دنگ رہ جائیں۔

چنانچہ اس نے ایک شبینہ مدرسے میں داخل ہو کر ڈرائنگ سیکھنا شروع کی۔ اور دن کے وقت ایک دکاندار کے پاس ملازمت کی۔ یہ دکان دار قبروں کے کتبوں کا کاروبار کرتا تھا۔ ایڈی کے ذمے کتبے تراشنے کا کام تھا۔ پھر کسی نے اسے بتایا کہ کتبے تراشنا خطرناک کام ہے۔ اس طرح سنگ مرمر کے ذرات پھیپھڑوں میں داخل ہو کر انسان کو بیمار کر دیتے ہیں۔ ایڈی ریکن بیکر کہتا ہے کہ میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے کسی اور دھندے کی تلاش شروع کر دی۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ چودہ سال کی عمر میں ایک خوش گوار صبح کو وہ ایک فٹ پاتھ کے کنارے کھڑا ٹکٹکی باندھے ایک موٹر کار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی موٹر کار نہیں دیکھی تھی، کون جانتا تھا کہ کولمبس اوہیو کے گلی کوچوں میں دوڑتی اور دندناتی ہوئی یہ کار اس کی قسمت کا رخ پھیر دے گی۔

اپنی پندرہویں سال گرہ سے پہلے اسے ایک موٹر گیراج میں کام مل چکا تھا۔ اس عمارت میں کسی زمانے میں اصطبل ہوا کرتا تھا۔ اور اب یہاں ایڈی دوسرے کاموں کے علاوہ کار چلانا بھی سیکھ رہا تھا۔ جب وہ پورا ڈرائیور بن گیا تو اس نے گیراج کے عقب میں اپنی ایک علیحدہ ورک شاپ کھول لی، اور خود ساختہ پرزوں سے موٹر کار بنانی شروع کر دی۔ اسی دوران میں کولمبس میں بھی موٹریں بنانے والی ایک فیکٹری کھل گئی، ایڈی ہر اتوار کو اس فیکٹری میں جاتا، اور اس کے مالکوں سے ملازمت کے لئے التجا کرتا، جب مسلسل آٹھارہ بار اس کی استدعا مسترد کر دی گئی تو

اس نے فیکٹری کے مالک کو یہ کہہ کر تذبذب میں ڈال دیا کہ ''آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں''۔لیکن آج سے میں آپ کے ملازموں کی فہرست میں شامل ہو گیا ہوں۔ میں کل صبح سے کام شروع کروں گا۔آپ ذرا دیکھیے تا کہ یہ فرش کس قدر میلا ہے۔ میں فرش صاف کروں گا۔آپ کے اوزار تیز کروں گا۔اور دوسرے تمام کاموں میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا۔سمجھے آپ؟''۔

تنخواہ؟۔اس نے تنخواہ کا کوئی ذکر نہ کیا۔وہ تو اس تلاش میں تھا کہ کسی بہانے اسے کام کرنے کا موقعہ مل جائے۔اور بالآخر اسے کام کرنے کا یہ موقع میسر آ گیا۔ خط و کتابت کے ذریعے سے انجینئرنگ کی تعلیم دینے والے ایک ادارے میں اپنا نام درج کرانے کے بعد وہ ان سنہری موقعوں سے فائدہ اٹھانے کی تیاریاں کرنے لگا، جواب اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔

اس کے بعد وہ تیزی سے ترقی کرتا گیا۔ورک مین سے فور مین بنا پھر اسسٹنٹ انجینئر، سیلز مین، برانچ منیجر۔

پھر اس پر ''تیز رفتاری اور کارہائے نمایاں کرنے کا جنون سوار ہو گیا۔'' جو موٹر کاروں کی دوڑوں میں لوگ تالیاں پیٹ کر اور پر جوش نعرے لگا کر ڈرائیوروں کو خراج تحسین پیش کرتے تو وہ ان کی خوش نصیبی پر پھولا نہ سماتا تھا۔اب اسے یہ احساس بھی ہو چلا تھا کہ ریسنگ ڈرائیور بننے کے لئے اسے اپنے مزاج میں تبدیلی کرنا ہو گی۔چنانچہ اس نے غصے کو قابو میں رکھنے کی کوشش شروع کی، اس نے اپنے اندر خود اعتمادی پیدا۔اس نے اپنے آپ کو مسکرانے پر مجبور کیا، حتی کہ لوگ اس کی

مخصوص مسکراہٹ سے پیار کرنے لگے۔

کاروں میں حصہ لینے والوں کے اعصاب مضبوط ہونے چاہئیں۔ ایڈی اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھا۔ اس لئے اس نے تمباکو نوشی اور شراب نوشی بالکل بند کر دی۔ اور ہر رات کو پورے دس بجے سو جانا اپنا معمول بنا لیا۔

پچیس برس کی عمر میں ایڈی ریکن بیکر اپنے آپ کو وقت کا سب سے بڑا ریسنگ ڈرائیور کی حیثیت سے تسلیم کرا چکا تھا۔

اور اب اس کے بارے میں ایک مضحکہ خیز بات بھی سن لیجیے کہ گذشتہ تیس برس میں اس نے سینکڑوں اور ہزاروں میل موٹر کاریں دوڑائی ہیں۔ لیکن اس کے پاس کبھی موٹر کار چلانے کا لائسنس نہیں ہوا اب بھی وہ بغیر لائسنس کے موٹر کار ہی چلاتا ہے۔

وہ اچھے اور برے شگونوں میں اعتقاد نہیں رکھتا۔ اس کے دوست اسے خرگوش کے پنجے، گھوڑے کے نعل اور خوش بختی کے ایسے نشان دیا کرتے تھے۔ جن پر ہاتھی کی تصویر کندہ ہوتی تھی۔ وہ یہ سب چیزیں لے لیا کرتا تھا۔ پھر ایک روز جب وہ گاڑی میں امریکہ کے ایک سرے سے دوسرے تک جا رہا تھا۔ تو اس نے خوش بختی کے ان تمام نشانوں کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ جب امریکہ میں پہلی جنگ عظیم میں شامل ہوا تو اس وقت ایڈی ریکن بیکر موٹر کاروں کی دوڑ میں تماشائیوں کا محبوب تھا۔ اسی زمانے میں وہ جنرل پرشنگ کے ڈرائیور کی حیثیت سے بحری جہاز میں فرانس پہنچا۔ لیکن صرف ایک جنرل کی کار چلانے کا کام اس کی دشوار پسند طبیعت کو راس نہ آیا۔ وہ ہنگامے کی تلاش میں تھا۔ اور بالآخر اس کی یہ خواہش پوری

ہو گئی۔ اسے خاکی وردی اور مشین گن مل گئی۔ پندرہ ماہ کے عرصے میں اس کا نام بہادری اور جرات کے شاندار مظاہروں کی بدولت میدان جنگ کے مشاہیر کی فہرست میں درج ہو گیا۔ اور تین حکومتوں کی طرف سے اس کی خدمات کے اعتراف کے طور پر اسے خاص میڈل عطا کیے گئے۔

تین سو ستر صفحے پر مشتمل رونگٹے کھڑے کر دینے والی ایک کتاب میں اس نے اپنے شاندار کارناموں کی داستان رقم کی ہے۔ اگر آپ ایک ایسی کتاب پڑھنے کے خواہش مند ہوں، جو جرات اور بہادری کے حیرت انگیز واقعات سے پر ہو تو اپنے شہر کی لائبریری میں جا کر ایڈی ریکن بیکر کی تصنیف "فائٹنگ دی فلائنگ سرکس" حاصل کیجیے۔ یہ ہوابازی کی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے۔

سر مالکم لاکم کیمپ بل

وہ پہلا شخص جس نے تین سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلائی۔

ایڈی ریکن بیکر کی داستان حیات رقم کرتے ہوئے مجھے سر مالکم لاکم کیمپ بل کی باتیں یاد آ گئی ہیں۔۔کیونکہ آج سے کچھ عرصہ پہلے ایک عشائیے میں مجھے ان دونوں شخصیات کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ ان دونوں کی بہت سی عادات مشترک تھیں۔ دونوں خاموش طبع اور خوش گفتار ہونے کے علاوہ "تیز رفتاری" کے جنون میں گرفتار تھے۔

مجھے علم ہے کہ ریکن بیکر نے تو ریسنگ کے خطرناک کھیل کو محض اس لئے اپنایا تھا کہ وہ مالی مشکلات کا شکار تھا۔ مگر سر مالکم لاکم کیمپ بل نے ایسا کیوں کیا؟۔ وہ تو کھاتا پیتا آدمی تھا، اور اسے دولت کی کوئی ہوس نہ تھی۔

پھر اس نے ریسنگ کیوں شروع کی؟۔ شہرت یا عظمت حاصل کرنے کے لئے، لیکن کیمپ بل کا جواب نفی میں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے تو محض تفریح کے لئے اس کھیل کو اپنایا تھا۔"

اس کے بعد میں نے ایڈی ریکن بیکر کی طرف دیکھا اور سوال کیا کہ سر مالکم کی ریس دیکھ کر اسے کتنی بار لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ کیونکہ سر مالکم جس تیز رفتاری سے کار دوڑاتا ہے۔ اسے دیکھ کر تماشائیوں کے دل دھڑکنے لگتے ہیں۔ اور ریکن

بیکر نے جو بذات خود بھی کاروں کی کوئی دو سو ریسیں جیت چکا تھا۔ یہ جواب دے کر مجھے حیرانی میں ڈال دیا کہ میں نے اسے کبھی کار دوڑاتے نہیں دیکھا، اور سچ پوچھو تو دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ کم از کم میرا اندازہ تو یہی ہے کہ وہ جب دوڑ میں شریک ہوتا ہے، تو موت اس کے سر پر منڈلا رہی ہوتی ہے۔ پتہ نہیں وہ کیسے بچ جاتا ہے۔

جس وقت میں یہ انٹرویو قلم بند کر رہا تھا۔ کسی انسان نے روئے زمین پر اتنی تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ آپ خود ہی اندازہ کیجیے کہ تین سو میل فی گھنٹہ، پانچ میل فی منٹ، نیویارک سے سان فرانسسکو تک دس گھنٹے میں۔ یہ سچ ہے کہ چار اور آدمیوں نے بھی 200 میل فی گھنٹہ سے زیادہ رفتار سے کاریں دوڑائی تھیں۔ یعنی سی گریوو، لوک ہارٹ یا کیچ اور رابیل۔۔۔ لیکن یہ سب کے سب انہی دوڑوں میں لقمہ اجل بن کر میدان چھوڑ چکے تھے۔ اب صرف کیمپ بل باقی رہ گیا تھا۔

سچ پوچھیے تو کیمپ بل فولاد کا بنا ہوا تھا۔ وہ کبھی پریشان نہیں ہوا۔ کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔ جب ریس ختم ہو جاتی ہے، تو وہ اتنے اطمینان کے ساتھ کار سے باہر نکلتا، جیسے کوئی شخص دفتر سے گھر آیا ہو۔

جب کیمپ بل کی عمر سولہ سال کی تھی تو اس نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ وہ بائیسکل ریسر بننا چاہتا ہے۔ اس کے باپ نے غصے میں اپنا سر پیٹ لیا، اور وقت ضائع کیے بغیر اپنے بیٹے کو لندن کی مشہور بیمہ کمپنی لنڈیڈز میں کلرک رکھوا دیا۔

سر مالکم کیمپ بل نے مجھے بتایا کہ وہ پورے دو سال اس دفتر میں کام کرتا رہا، اور اسے کبھی ایک پنس نہ ملا۔ تیسرے سال بیمہ کمپنی والے اسے کچھ نہ کچھ تنخواہ دینے پر

رضامند ہو گئے۔ اور کچھ ہی عرصے بعد وہ اس مشہور ادارے کے ڈائریکٹروں میں شامل ہو گیا۔

صرف انیس برس کی عمر میں اسے یہ بات سوجھی کہ انگریزی اخباروں کا ہتک عزت کے دعووں کے خلاف بیمہ کیا جائے۔ امریکہ کی نسبت انگلستان میں ہتک عزت کے قوانین بہت سخت ہیں۔ کچھ ہی عرصے میں سر مالکم کیمپ بل ملک بھر کے تمام اخباروں کو اپنا ممبر بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی کاروبار کی بدولت اس نے اکیس سال کی عمر میں اچھی خاصی دولت پیدا کر لی۔ پھر یکایک اس نے موٹر سائیکلیں اور کاریں خرید کر دوڑوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس نے تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑنے کے شوق کو پورا کرنے کے لئے پچاس ہزار پونڈ سے زیادہ خرچ کیے۔ اس نے کسی ایسی طویل شاہراہ کی تلاش میں جس پر وہ تیز رفتاری کے ساتھ اپنے شوق کی تکمیل کر سکتا تھا۔ ہزاروں میل کا سفر کیا۔ وہ ڈنمارک صحرائے اعظم، جنوبی افریقہ اور فلوریڈا گیا۔ لیکن بعد میں اسے یہی معلوم ہوا کہ دنیا میں ریسنگ کی سب سے بہترین شاہراہ اوناہ میں ہے۔۔۔ وہ جگہ جہاں آج سے کوئی ایک کروڑ سال پہلے نمکین جھیلیں ہوا کرتی تھیں۔

ایک بار وہ ڈنمارک میں ایک ریس میں حصہ لیتے وقت ایک سو چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کار دوڑا رہا تھا۔ کہ یکا یک کار کا اگلا ٹائر پھٹ گیا۔ کار کا رخ سڑک کے کنارے کی طرف مڑ گیا۔ جہاں تماشائی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کم سن لڑکا ہلاک ہو گیا، اور کار رکتے رکتے بھی ایک میل کا فاصلہ طے کر گئی۔

سر مالکم کیمپ بل نے مجھے بتایا کہ اس کی زندگی کا سب سے زیادہ حیران کن حادثہ پہلی جنگ عظیم کے دوران پیش آیا۔ ان دنوں وہ ہوا باز کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اور رود بار کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے مغربی محاذ کی طرف جایا کرتا تھا۔ ان دنوں اسے ایسے ایسے جہاز اڑانا پڑے، جو کبھی اس نے زندگی بھر نہیں دیکھے تھے۔ اس نے ایسی جگہوں پر جہاز اتارے جو اوپر سے دکھائی بھی نہ دیتی تھیں۔ بعض اوقات پرواز کے دوران وہ جرمنی کے جہازوں کے نرغے میں پھنس جاتا، جرمن ہوا باز بادلوں سے نکل کر اس کے جہاز پر لپکتے، اور اس پر مشین گن کی گولیوں کی بوچھاڑ کرتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ چار سال تک یہی کھیل کھیلتا رہا۔ اور اسے خراش تک نہ آئی۔

لیکن کیمپ بل کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ جزیرہ کوکس میں ہوا تھا۔ اس نے اس کارنامے کے متعلق ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس جزیرے میں سر مالکم کیمپ بل ایک گم شدہ خزانے کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ جزیرہ کوکس دنیا بھر میں سب سے زیادہ اکتا دینے والی جگہ ہے۔ وہاں آپ کو نہ تو کوئی مکان دکھائی دیتا ہے۔ اور نہ ہی انسان۔ اس جزیرے کے باشندے دن کے وقت پہاڑیوں میں چھپے رہتے ہیں۔ رات کو جب وہ جھاڑیوں سے نکل کر پانی کے کنارے پر آتے ہیں تو اس وقت بھی یوں چپ سادھے ہوتے ہیں کہ جیسے پام کے درختوں کے سائے ہوں۔ کسی سفید فام کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ مکڑی، چونٹیاں اور کیڑے مکوڑے یہی اس جزیرے کی کل کائنات ہیں۔ یہاں مکھیاں اور مچھر منڈلاتے رہتے ہیں۔ اور آس

پاس ویل مچھلیاں پانی سے سر نکال کر اس ماحول کا نظارہ کرتی رہتی ہیں۔

خزانے کی تلاش میں سر مالکم کیمپ بل کو ایک چھوٹی سی ندی سے ہو کر ایک بہت بڑے پتھر میں دراڑ ڈھونڈنا تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس دراڑ میں کوے کے پر کو چابی کی طرح گھمانے سے پتھر دروازے کی طرح کھل جائے گا۔ اور اس کے بعد اندر داخل ہوتے ہی اسے بحری قزاقوں کا گم شدہ خزانہ مل جائے گا۔ سونا اور اشرفیاں ،الہ دین کا خزانہ۔

ایک روز جب وہ خاردار جھاڑیوں سے بچتا، اٹھتا بیٹھتا، رینگتا، دوڑتا راستہ طے کر رہا تھا، تو اس نے محسوس کیا کہ ہوا کا رخ شمال کی طرف ہے۔ اسے بھی اسی سمت سفر کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے اور اس کے ساتھی نے فیصلہ کیا کہ جھاڑیوں کو آگ لگا کر چلنے کے لئے راستہ بنایا جائے۔ اس نے دیا سلائی جلائی۔ فوراً ہی جنگل میں آگ لگ گئی۔ اور صرف پانچ منٹ میں پورا جنگل آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔

وہ یہ دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا کہ شعلے چاروں سمت لپک رہے ہیں۔ وہ فوراً جھیل کے کنارے چت لیٹ گیا۔ ہزاروں ایکڑ لمبا چوڑا جنگل آتش زدگی کی زد میں تھا۔ اور شعلے تیزی کے ساتھ آسمان کی طرف لپک رہے تھے۔ کچھ دیر کے لئے اتنی گرمی ہو گئی کہ اس نے محسوس کیا کہ اگلے لمحے اسے پانی میں کودنا پڑے گا۔ جہاں وہ کسی نہ کسی لمحہ آدم خور مچھلی کا لقمہ بن جائیں گے۔ لیکن پام کے درخت اتنے سرسبز تھے کہ انہیں آگ نہ لگی۔ اس طرح اس کی جان بچ گئی۔

گم شدہ خزانے کی تلاش میں تین ہفتے سرگرداں رہنے کے بعد سر مالکم کیمپ بل

قزاقوں کی دولت کے انعام کے طور پر زخمی پاؤں، ہاتھوں کے ٹوٹے ہوئے ناخن اور مجروح پیٹھ دکھا سکتا تھا۔ وہ انگریز کی بجائے کوئی مفرور مجرم دکھائی دیتا تھا۔ تھکا ماندہ، دل برداشتہ اور بیمار، وہ گھر جانے کے لئے بے چین تھا۔

یہ کہانی سنانے کے بعد سر مالکم کیمپ بل نے مجھے کہا کہ وہ ایک بار جزیرہ کوکس جائے گا، اور اگر وہاں کوئی گم شدہ خزانہ ہے، تو اسے ضرور تلاش کرے گا۔

''آپ کو شاید علم نہیں'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔۔۔''میں ذرا سے کارنامے کے لئے نصف دنیا کی خاک چھان سکتا ہوں۔''

ایلی گلبرسٹن

اس نے بیس منٹ کے اندر اندر ایک پونڈ سے دو ہزار پونڈ کما لیے۔

1921ء میں ایک جوشیلا نوجوان پیرس کے بازاروں میں مٹر گشت کر رہا تھا۔ اس کی جیبیں تقریباً خالی تھیں، لیکن اس کا دل غصے اور نفرت کے جذبے سے پر تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟۔ کیونکہ اس کے ایک لاکھ پونڈ لوٹ لیے گئے تھے۔ کئی سال پہلے اس کا باپ جو ایک امریکی جیالوجسٹ اور انجینئر تھا۔ روس میں جا کر آباد ہو گیا، اور وہاں اس نے تیل دریافت کیا اور دولت مند بن گیا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد روسیوں نے اس کی تمام جائیداد ضبط کر کے اسے کنگال کر دیا۔ اس کا بیٹا اپنی جان بچانے کے لئے پیرس بھاگ گیا۔ اور 1921ء میں وہ اسی جگہ مارا مارا پھر رہا تھا۔ فاقوں اور اس کے درمیان صرف چار پونڈ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

آخر تھک ہار کر اس نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اور ایک جوئے خانے میں جا کر ایک پاونڈ داؤ پر لگا دیا۔ جب اس کے پتے کھلنے لگے تو ایک فرانسیسی نے اس کے پاؤں کو اپنے بھاری بھر کم جوتوں تلے مسل دیا۔ وہ غصے سے بھڑک اٹھا، اور اس نے فرانسیسی کو سور کے بچے کا خطاب دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ وہ اس سے سب کے سامنے معافی مانگے۔

کیا فرانسیسی باشندے نے معافی مانگ لی۔ جی نہیں! اس نے صاف انکار کر دیا

۔وہ اس ذلت کو برداشت کرنے پر تیار نہ تھا۔ چنانچہ وہ مرنے مارنے پر اتر آیا۔اس نے نوجوان کو چیلنج کیا کہ اگر اس میں دم خم ہے تو اس سے لڑ کر دیکھ لے۔ان کے پاس نہ تو تلواریں تھیں اور نہ پستول۔ اس لئے وہ کلب سے باہر نکل آئے اور بھوکے شیروں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔خوب ہاتھا پائی کے بعد جب دونوں کے چہرے لہولہان ہو گئے تو لوگوں نے انہیں چھڑا دیا۔

جب سر پھرا نوجوان جوئے کی میز پر واپس آیا تو وہ حیران و ششدر رہ گیا۔ جوئے کی ساری رقم اس کے قدموں پر تھی۔جس وقت وہ فرانسیسی باشندے سے ہاتھا پائی میں مصروف تھا۔جوئے خانے کے اندر داؤ پر لگائی ہوئی اس کی رقم میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔جوئے خانے سے باہر نکلتے ہوئے اس کی جیب میں پورے دو ہزار پونڈ تھے۔

اس ہاتھا پائی نے اس کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔اس کے علاوہ اور بھی لاکھوں افراد اس حادثے سے اثر انداز ہوئے۔آپ پوچھیں گے کیسے؟۔کیا آپ کو برج کھیلنے کا گل برسٹن طریقہ آتا ہے۔؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ اگر جوئے خانے کے باہر وہ ہاتھا پائی نہ ہوتی تو شاید گل برسٹن طریقہ کبھی دریافت نہ ہوتا۔جب ایلی گل برسٹن فرانسیسی باشندے کے ساتھ ہاتھا پائی سے فارغ ہونے کے بعد جوئے خانے کی طرف واپس آ رہا تھا تو وہ اس بات کا مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو کر اپنی جائیداد واپس لینے کی کوشش کرے گا۔لیکن یکا یک دو ہزار پونڈ مل جانے کے بعد اس نے فوج اور جنگ کا خیال دل سے نکال دیا۔روسی حکومت کے خلاف

ایک لاکھ پونڈ کا دعویٰ دائر کرنے کے بعد اب وہ ناول نگار یا اقتصادیات کا پروفیسر بننے کے ارادے باندھنے لگا۔

یہ 1921ء کی بات ہے۔ ان دنوں گل برسٹن تاش کا نکما کھلاڑی تھا۔ مگر اب وہ برج کے کھیل سے سالانہ ایک لاکھ پونڈ، ہفتہ وار دو ہزار پونڈ کماتا ہے۔ وہ سال میں چھ ہزار پونڈ محض ان سوالات کے جوابات بھیجنے پر صرف کرتا ہے۔ جو برج کے شوقینوں کی طرف سے اس سے پوچھے جاتے ہیں۔ اس کے اسٹنٹ بغیر کسی معاوضے کے ہر سوال کا جواب دیتے ہیں۔

کنٹریکٹ برج کے سب سے بڑے کھلاڑی گل برسٹن کا باپ ایک مذہبی آدمی تھا۔ جو کہا کرتا تھا کہ تاش کھیلنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اور تاش کے پتے شیطان نے دریافت کیے ہیں۔

کارل مارکس اور ٹالسٹائی کا عقیدت مند ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ اشتراکی نظریات کا حامی رہا ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ روس کے ایک مدرسے میں زیر تعلیم تھا تو اس نے اپنے دوسرے ہم جولیوں سے مل کر ایک خفیہ انقلابی کمیٹی بنا رکھی تھی۔ انہی دنوں ایک بار وہ اپنے پاس پورٹ پر سوئزرلینڈ گیا۔ اور وہاں سے ایک بالشویکی اخبار کے بہت سے شمارے سمگل کر کے لے آیا۔ یہ اخبار لینن کی زیر ادارت جینوا میں چھپتا تھا۔ اور روس میں اس کا داخلہ ممنوع تھا۔

امریکہ پہنچنے پر اس نے کوشش کی کہ اسے فلسفہ اور سوشیالوجی پڑھانے کا موقع مل جائے۔ لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ پھر اس نے کوئلے کا کاروبار کرنا چاہا، لیکن اس

میں بھی مار کھائی۔ پھر اس نے کافی تجارت شروع کی لیکن اس میں بھی سخت نقصان اٹھایا۔

آخر کار ہر طرف سے ناکام ہونے کے بعد وہ سوشلسٹوں کے ایک گروپ کو فرانسیسی ادب پڑھانے کے ساتھ ساتھ اپنے ایک موسیقار بھائی کے مینجر کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔

اس وقت اسے کبھی اس بات کا خیال نہ آیا تھا کہ وہ برج سکھانے کی کوشش کرے۔ یہ سچ ہے کہ وہ تاش کا معمولی کھلاڑی تھا۔ لیکن وہ طبیعت کا بہت ضدی تھا۔ وہ اس قدر سوالات پوچھتا اور اتنی جانچ پڑتال کرتا کہ کوئی شخص اس کے ساتھ کھیلنے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا۔ اس نے برج کے متعلق کئی کتابیں پڑھیں۔ لیکن جب ان کے مطالعہ سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو اس نے خود اس موضوع پر کتاب لکھنا شروع کر دی۔ اگلے چند برسوں میں اس نے برج کے متعلق پانچ کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن وہ سب کی سب بے کار تھیں۔ اور اسے خود بھی اس بات کا احساس تھا۔ چنانچہ اس نے ان کتابوں کو چھپوانے کا خیال ترک کر کے ان کے مسودوں کو نذر آتش کر دیا۔ اس کے بعد اس نے جتنی کتابیں لکھیں، ان سب کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ اور ان کی کوئی ایک لاکھ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔

گل برسٹن 1910ء میں پہلی بار امریکہ گیا تھا۔ اس وقت اس کی روسی ماں نے اسے بھیجا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا ژال میں تعلیم حاصل کرے۔ لیکن وہ دسویں کے امتحان میں فیل ہو گیا۔ اور فیل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ انگریزی اچھی طرح نہیں

جانتا تھا۔

ذرا اندازہ کیجیے کہ وہ ایک امریکی شہری تھا۔ وہ امریکی تاریخ کے تمام ادوار سے باخبر تھا۔ روسی، جرمنی، فرانسیسی، ہسپانوی، اور اطالوی زبان روانی سے بول سکتا تھا۔ لیکن وہ انگریزی کے امتحان میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ ژال سے نکل کر کینڈا پہنچ کر اس نے ریلوے میں ٹائم کیپر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ اس جگہ اسے مزدوروں کے اوقات کا حساب رکھنا پڑتا تھا۔ لیکن اپنے کام کی بجائے اس نے اپنی شعلہ بیان تقریروں سے مزدوروں کو بتایا کہ کمپنی والے انہیں بہت کم مزدوری دیتے ہیں۔ اور ان کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس نے فتنہ کھڑا کیا۔ ہڑتال کرائی اور بالآخر دھکے کھا کر ملازمت سے نکال دیا گیا۔

پھر قریبی قصبے تک پہنچنے کے لئے اسے دو سو میل کا سفر پیدل طے کرنا پڑا۔ راستے میں وہ گھر گھر جا کر بھیک مانگتا اور اپنا پیٹ پالتا رہا۔

بہت ممکن ہے کہ اکثر عورتیں جواب گالبرسٹن طریقے سے تاش کھیلتی ہیں۔ اس عظیم کھلاڑی کے تنگ دستی کے دنوں میں یہ جانے بغیر کہ وہ کون ہے، اسے سینڈوچز اور گرم کافی دے چکی ہوں۔

☆☆☆

فرانسس ژیٹس براؤن

پولیس اسے ایک خاتون کے لباس میں نہ پہچان سکی۔

بیس برس پہلے کا ذکر ہے کہ انتالیس برس کا چھریرے جسم اور سنجیدہ چہرے والا ایک نوجوان مجھے ملنے میرے مکان پر آیا۔ اور مشرق کی طلسماتی سرزمین پر اپنے عجیب وغریب معرکوں سے مجھے مسحور کرتا رہا۔ سولہ برس سے انتالیس برس کی عمر تک وہ بہت سے میدان جنگ میں کئی دفعہ موت کو دیکھ چکا تھا۔

وہ بغداد اور قسطنطنیہ میں جنگی قیدی رہ چکا تھا۔ وہ میسوپوٹیمیا کے گرم صحراؤں میں ترکوں سے لڑ چکا تھا۔ اور فلانڈرز کے دلدلی کھیتوں میں جرمنوں سے مقابلہ کر چکا تھا۔ اس نے ''خونی سال'' نامی ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس کے باوجود لارنس آف عریبیہ کی طرح میں نے اس کا انداز گفتگو برداشتہ پایا۔ وہ جنگ کے بجائے شاعری اور فلسفے میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔

بیس برس کی فوجی ملازمت کے بعد بھی فرانسس ژیٹس براؤن نے کچھ پس انداز نہ کیا تھا۔ اس نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ مستقبل میں کیا کرنے والا ہے؟۔ وہ اپنی زندگی کے متعلق بالکل متفکر نہ تھا۔ مشرق میں رہ کر وہ مشرقی فلسفے سے بہت متاثر تھا۔ اس نے مشرق کی بزرگ ہستیوں اور فلسفے کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اور اسے راہ نجات کے اسرار معلوم ہو گئے تھے۔

ہم اور آپ کی طرح اس نے فقط ایک زندگی نہیں گزاری تھی۔ اپنی انتالیس سالہ زندگی میں وہ کئی زندگیاں گزار چکا تھا۔ آخر اس نے اپنی جدو جہد سے پر زندگی کی داستان ایک کتاب کی شکل میں لکھی، اور اس کا نام "ایک بنگالی جادو پیا کی زندگیاں رکھا۔" یہ کتاب 1930ء کی سنسنی خیز کامیابی تھی۔ اس کتاب کی کہانی پر ہالی وڈ نے ایک فلم بنائی، جو لوگوں میں بہت مقبول ہوئی، اور اس نے بہت سا نفع کمایا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہالی وڈ کی دوسرے سوانح حیات فلموں کی طرح اس میں بھی بعض حقائق سے گریز کیا گیا تھا۔

فرانسس ژیٹس براؤن فقط انیس برس کا تھا کہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ وہ "رائل بنگال لانسرز" یونٹ کا ممبر تھا۔ "رائل بنگال لانسرز" جس پر برطانوی فوج کو ناز تھا۔ وہ چیدہ چیدہ سپاہیوں کا یونٹ تھا۔ اور جن کی تنخواہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور انہیں اپنے گھوڑے اور دوسرا سامان بھی خود ہی خریدنا پڑتا تھا۔ لیکن وہ ہندوستان میں کسی نفع کے پیش نظر نہ گئے تھے۔ ایثار کا جذبہ انہیں وہاں لایا تھا۔ وہی جذبہ جو چینی، چائنیز گارڈن ہر فرانسس ڈریک اور سر والٹر ریلے کو زمین کے دوسرے کنارے تک لے گیا تھا۔

وہ صبح پانچ بجے اٹھتے اور دھوپ میں اس وقت تک ڈرل کرتے رہتے، حتیٰ کہ گرمی سے ان کی رائفلوں کا لوہا تپنے لگتا، اور انہیں ہاتھ میں پکڑنا ناقابل برداشت ہو جاتا۔

ان کی تفریح یہ تھی کہ گرمیوں کی جان لیوا سہ پہروں میں پولو کھیلا کرتے تھے۔ گرمی اور ملیریا سے ان کے جسموں کا برا حال ہو جاتا تھا۔ لیکن فرانسس ژیٹس براؤن نے

مجھے بتایا کہ ہندوستان کے تمام کھیلوں میں سب سے زیادہ ولولہ انگیز اور خطرناک کھیل سوروں کا شکار تھا۔ انہیں فقط ایک نیزے سے سوروں کا شکار کرنا ہوتا تھا۔

زخمی سور جس قدر خطرناک جانور ہوتا ہے۔ شاید ہی کوئی دوسرا جانور ہو۔ اس کے اندر ایک شیر جیسی ہمت اور ایک تیز رو گھوڑے جیسی پھرتی آ جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اس کی دسترس میں آ جانا یقینی موت ہے۔

میں نے ژیٹس براؤن سے پوچھا کہ وہ کوئی ایسا واقعہ سنائے، جس میں وہ موت کے منہ سے بال بال بچا ہو۔ اس نے بتایا کہ سور کے شکار دوران ایک ایسا واقعہ رونما ہوا تھا۔ اس نے اور اس کے آدمیوں نے مل کر ایک بڑا سور جھاڑیوں سے نکالا۔ جنگلی سور کھیتوں کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ اور اسکی سونڈ دھوپ میں چمک رہی تھی۔ ژیٹس براؤن گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے تعاقب میں چل پڑا۔ جونہی اس نے اس کے جسم میں نیزہ مارا۔ اس کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ گھوڑے کا سارا بوجھ ژیٹس براؤن کے اوپر آ رہا۔ اس نے گھوڑے کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ادھر نیزے سے زخمی سور نیزے کی انی اپنے جسم سے نکالنے میں مصروف تھا۔ اتنے میں گھوڑا چھلانگ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ژیٹس براؤن، اب تک زخمی سور بھی نیزے سے نجات حاصل کر چکا تھا۔ جونہی سور اس کی طرف بڑھا۔ وہ بھاگ کر ایک قریبی درخت پر چڑھ گیا۔ اور جب تک اس کے آدمی اس کی مدد کو نہیں پہنچے وہ وہیں بیٹھا رہا۔ گھوڑے پر سے گرتے ہی اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا۔ اسے اور بہت سی چوٹیں آئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد سور بھی اپنے

زخم کی تاب نہ لا کر مر گیا۔فقط گھوڑے کو کوئی چوٹ نہ آئی تھی۔اور وہ بڑے آرام سے گھاس چرنے میں مصروف تھا۔

لیکن میرے خیال میں ٹریٹس براؤن کی حیرت ناک زندگی میں سب سے عجیب وغریب وہ واقعہ ہے۔جب اس نے ایک خاتون کا روپ دھارا تھا۔وہ میسوپوٹامیہ میں ترکوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ترکوں نے اسے قید کر کے کیڑوں مکوڑوں سے بھری جیل میں ڈال دیا۔وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔لیکن شہر سے باہر نہ نکل سکا۔ترک بڑی تندہی سے اسے تلاش کر رہے تھے۔

ظاہر ہے وہ ایک انگریز افسر کی تلاش میں تھے۔اور وہ ایک ایسی جرمن خاتون پر کس طرح شبہ کر سکتے تھے۔جو ایک کیفے میں ایک روسی شہزادے کو ملنے آیا کرتی تھی۔ترکی حکومت اس روسی شہزادے کی بھی نگرانی کر رہی تھی۔لیکن جذباتی ترک کسی کے معاشقے میں دخل اندازی کی کوشش نہیں کرتے۔لہذا جب ٹریٹس براؤن اس جرمن خاتون کا بھیس بدل کر روسی شہزادے کو ملنے اس کیفے میں آیا تو موخرالذکر اسے دیکھ کر اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔وہ بڑے احترام سے جھکا اور اس کے ہاتھوں پر بوسہ دینے لگا۔ترکی جاسوس ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے اور اپنے شانے ہلانے لگے۔آخر ایک مشتبہ روسی شہزادہ بھی رومانس کا حقدار ہو سکتا ہے۔

لیکن جرمن خاتون کے بھیس میں بھی وہ شہر سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔آخر اس نے اپنی قومیت اور جنس تبدیل کی۔اور ایک ہنگری کاریگر بن گیا۔جسے اسلحہ بنانے والی ایک فیکٹری سے جواب مل گیا تھا۔اس نے اپنی مونچھیں بڑھا کر ان کا رخ

اوپر کی جانب موڑ لیا۔ اور اتنا عجیب وغریب لباس پہنا کہ بالکل ایک کامیڈین لگتا تھا۔ ترکوں کو کبھی شبہ نہ ہو سکا کہ وہ اصلی یا نقلی ہنگری کاری گر تھا۔

آخر وہ پکڑا گیا، اور اسے دوبارہ قید کر دیا گیا۔ لیکن ایک دفعہ وہ پھر وہاں سے بھاگ نکلا۔ یونانیوں کا ایک گروہ قید خانے کے باغ میں کھانا کھانے کے لئے آیا کرتا تھا۔ ایک دن جب وہ باغ سے باہر نکلنے لگے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ وہ شہر کی گلیوں میں سے اتنی متحمل مزاجی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ جیسے مہاتما بدھ کی پرچھائیں ہو۔

میرے پوچھنے پر کہ اس نے جنگ کے دوران سب سے زیادہ خطرناک منظر کون سا دیکھا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''جب میں جنگی قیدی تھا۔'' تو ترکوں نے قیدیوں کے ایک کیمپ تک مجھے پہنچانے کے لئے مجھے دو سو میل کا سفر پیدل کرنے پر مجبور کیا۔ راستے میں میں نے ایک ایسا قصبہ دیکھا۔ جس میں ایک انسانی شکل بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ ترکی فوجوں نے آرمینیا کا وہ سارا قصبہ تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ہر طرف موت کی خاموشی مسلط تھی۔ خاموش گلیوں میں چند کتے گھوم رہے تھے۔ اور مکانوں کے اوپر گدھ چکر لگا رہے تھے۔


مغنی

انریکو کاروسو

جب وہ تھیٹر میں گانے آتا تو سامعین اس پر گندے انڈے پھینکتے

جب 1921ء میں انریکو کاروسو کا اڑتالیس برس کی عمر میں انتقال ہو گیا تو پوری قوم میں رنج والم کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ وہ مغنی اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکا تھا۔ جس کی آواز ہر ذی نفس کی روح میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھی۔ موت کے بے رحم ہاتھوں نے انریکو کاروسو کو دنیا کے ہاتھوں سے چھین لیا تھا۔ لیکن اس کی روح کی گداز تانوں کی یاد اب بھی ہر دل میں باقی تھی۔ کام کی زیادتی اور تھکاوٹ کی وجہ سے اسے معمولی زکام ہوا۔ اس نے پرواہ نہ کی اور مسلسل چھ ماہ تک بڑی دلیری سے موت کا مقابلہ کرتا رہا۔ ادھر اس کے لاکھوں عقیدت مند خداوند ایزدی سے اس کی صحت یابی کی دعائیں مانگتے رہے۔

انریکو کاروسو کی سحر انگیز آواز صرف قدرت ہی کی دین نہیں تھی۔ بلکہ ان تھک محنت اور مسلسل جدوجہد اور عزم کا انعام تھی۔

ابتدا میں اس کی آواز اتنی ہلکی پھلکی اور باریک تھی کہ اس کے ایک استاد نے اسے صاف کہہ دیا کہ تم نہیں گا سکتے، کیونکہ تمہاری آواز کسی کام کی نہیں، ایسے لگتا ہے جیسے جھینگر بول رہے ہوں۔

کئی برسوں تک یہ کیفیت رہی کہ وہ جب تان اوپر اٹھاتا تو اس کی آواز پھٹ

جاتی۔ اور گاتے وقت اس کی حرکات اور اداکاری تو اس قدر گئی گزری تھی کہ ایک بار لوگ اس پر آوازیں کسنے سے باز نہ آئے۔ بہت کم لوگوں کی زندگی میں انریکو کاروسو جیسی کامیابی نصیب ہوئی ہوگی۔ وہ مرنے کے باوجود ہمیشہ زندہ رہے گا۔ لیکن جب اس کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا تو اس وقت بھی جب اسے اپنی پرانی زندگی کے روح فرسا واقعات یاد آتے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔

وہ ابھی پندرہ برس کا تھا۔ کہ اس کی والدہ انتقال کر گئی۔ اس کی موت کا کاروسو کو اتنا قلق ہوا کہ جہاں بھی جاتا۔ اس کی تصویر اپنے پاس رکھتا۔ اس کی ماں نے اکیس بچوں کو جنم دیا تھا۔ ان میں سے اٹھارہ نے بچپن ہی میں دنیا سے موڑ لیا۔ صرف تین باقی بچے۔ وہ ایک معمولی دیہاتی عورت تھی۔ جس نے اپنی زندگی میں مشکلات اور مصیبتوں کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اس کے ایک بیٹے کے اندر عظیم صلاحیتیں خوابیدہ ہیں۔ اور اس کے نزدیک ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی بھی ہیچ تھی ۔ کاروسو کہا کرتا تھا کہ میری ماں محض اس لئے ننگے پاؤں چلتی تھی کہ میں گا سکوں۔ یہ کہتے ہوئے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ وہ مشکل سے دس برس کا ہوا تو اس کے باپ نے اسے مدرسے سے اٹھا کر ایک کارخانے میں ملازم کرا دیا۔ ہر شام کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد کاروسو موسیقی کا سبق لیتا تھا۔ اکیس برس کی عمر تک وہ اس کارخانے میں بھاڑ جھونکتا رہا۔

انہی دنوں اسے ایک قریبی کافی ہاؤس میں گانے کا کام مل گیا۔ کبھی کبھار وہ کسی

حسین وجمیل خاتون کے گھر کی کھڑکی کے نیچے بھی معمولی معاوضے پر گانا گا دیا کرتا تھا۔ ایسی خواتین کے بھدی آواز والے عاشق بڑی دلیری سی چاندنی راتوں میں کھڑکیوں کے نیچے کھڑے ہو کر اپنے ہونٹوں اور ہاتھوں کو ہلا کر اداکاری کرتے۔ اور ان کے پاس ہی کسی جھاڑی کے پیچھے چھپا ہوا کاروسو اپالو کی سی مدھر لے میں ایسے گیت گاتا، جو روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتے تھے۔

بالآخر جب اسے پہلی بار تھیٹر میں گانے کا موقع میسر آیا، تو وہ ریہرسل میں اتنا گھبرا گیا کہ اس کی آواز پھٹ گئی، اور یوں سنائی دینے لگا، جیسے کوئی شیشے کے ٹکڑے زمین پر پٹخ رہا ہو۔ اس نے کئی بار کوشش کی، لیکن ہر تان پہلے سے زیادہ مایوس کن ثابت ہوئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوا تھیٹر سے باہر نکل آیا۔ جب اس نے سچ مچ تھیٹر کی سٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو حواس باختہ ہو گیا۔ وہ اتنا گھبرا گیا کہ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے بلیوں کی آوازیں نکال نکال کر اس کی آواز کو دبا دیا۔ ان دنوں تھیٹر والے صرف اس کا امتحان لے رہے تھے۔ ایک شام تھیٹر کا سب سے بڑا مغنی اچانک بیمار پڑ گیا۔ کاروسو غیر حاضر تھا۔ گلیوں اور بازاروں میں اسے ڈھونڈنے کے لئے ملازم دوڑائے گئے۔ آخر کار وہ ایک شراب خانے میں بیٹھا ہوا مل گیا۔ وہ پوری تیزی سے تھیٹر کی طرف بھاگا۔ جب وہ جوش وخروش سے بھاگتا ہوا وہاں پہنچا تو اس کا سانس اکھڑا ہوا تھا۔ ڈرائینگ روم کی گھٹن اور شراب کے نشے نے اس کے دماغ کو اور زیادہ گرما دیا۔ یکا یک اسے ساری دنیا گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ اور جب کاروسو نے سٹیج پر قدم رکھا تو ہال میں قیامت آ گئی۔

جب اس نے گانا ختم کیا تو لوگوں نے گندے انڈے پھینک کر اسے خراج عقیدت پیش کیا۔ اگلے روز وہ اس قدر دل برداشتہ ہو گیا کہ اس نے اپنی جان لینے کا فیصلہ کیا۔

اس کی جیب میں صرف اتنے پیسے تھے کہ جن سے صرف ایک شراب کی بوتل آ سکتی تھی۔ وہ صبح سے بھوکا تھا۔ اور جس وقت جام پر جام چڑھاتے ہوئے وہ خودکشی کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ تو شراب خانے کا دروازہ کھلا اور تھیٹر کا ایک ملازم اندر داخل ہوا۔ ''کارسو'' وہ چلایا۔ کارسو! جلدی آؤ۔ لوگ بڑے گویے کا گانا نہیں سنتے۔ انہوں نے آوازیں کس کر اسے بھگا دیا۔ وہ کہتے ہیں کارسو کو بلاؤ۔''

مجھے بلاتے ہیں'' کارسو چلایا'' کیا بکواس ہے بھئی۔ وہ تو میرا نام بھی نہیں جانتے۔

''واقعی وہ تمہارا نام نہیں جانتے، لیکن وہ تمہیں بلا رہے ہیں۔'' ملازم نے کہا وہ کہتے ہیں اس شرابی کو بلاؤ۔

کارو سو مرنے سے پہلے کروڑ پتی بن چکا تھا۔ صرف اپنے گانوں کے گراموفون ریکارڈوں سے اسے 400,000 پونڈ کی آمدنی ہوئی تھی، ۔ لیکن اس کے باوجود نوجوانی کی مفلسی نے اس کے ذہن پر اتنے گہرے نقوش چھوڑے تھے کہ وہ جو بھی روپیہ خرچ کرتا تھا۔ اپنی ایک چھوٹی سی کتاب میں اس کا پورا پورا حساب رکھتا تھا۔ خواہ وہ جوتے کا تسمہ خریدے یا اپنے کمرے کی سجاوٹ کے لئے ہاتھی دانت کا سامان۔ اس کتاب میں ایک ایک پائی کی تفصیل درج ہوتی۔

اطالوی کاشتکار گھرانے سے توہم پرستی۔۔۔ ورثے میں ملی تھی۔ اپنی موت

کے دن تک وہ نظر بد سے بڑا خائف تھا۔ نجومی سے مشورہ کیے بغیر کبھی سمندر پار نہیں جاتا تھا۔ جمعے کے روز نہ تو نیا سوٹ پہنتا تھا۔ نہ کسی سیڑھی کے پاس سے گزرتا تھا۔ اور دنیا کی کوئی طاقت منگل اور جمعے کے روز اسے سفر یا کوئی نیا کام شروع کرنے پر مجبور نہ کر سکتی تھی۔

اسے صفائی کا جنون تھا۔ جتنی بار گھر آتا، جوتے سے لے کر ہیٹ تک، جسم پر پہنی ہوئی ہر چیز تبدیل کرتا تھا۔

خوش الحانی میں کوئی اس کا ہم عصر نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ ڈریسنگ روم میں میک اپ کرتے ہوئے سگرٹ پر سگرٹ پھونکا کرتا تھا۔ جب لوگ اس سے پوچھتے کہ کیا تمباکو نوشی سے اس کی آواز خراب نہیں ہوتی، تو وہ خوب قہقہے لگاتا۔ سٹیج پر جانے سے پہلے وہ ہمیشہ شراب میں سوڈا ملا کر پیا کرتا تھا۔ تا کہ گلا صاف ہو جائے۔

اس نے دس برس کی عمر میں سکول چھوڑ دیا تھا۔ اس نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ وہ اپنی بیوی سے کہا کرتا تھا کہ مجھے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟۔ میں بذات خود زندگی سے سبق لیتا ہوں۔

کتابیں پڑھنے کی بجائے وہ ٹکٹیں اور نایاب سکے اکٹھے کرنے میں وقت گزارا کرتا تھا۔ وہ خاکے اور کارٹون بنانے میں کمال رکھتا تھا۔ اور ہر ہفتہ اٹلی کے کسی نہ کسی رسالہ کو اپنا بنایا ہوا کارٹون بھیجا کرتا تھا۔

وہ نیپلز میں پیدا ہوا۔ لیکن جب پہلی بار اس نے گانے کی کوشش کی، تو اخباروں نے اس پر شدید نکتہ چینی کی، اور لوگ اس کی آواز سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے۔ کارو

سو کو اس بات سے بہت دکھ پہنچا اور وہ زندگی بھر اس واقعہ کو فراموش نہیں کر سکا۔ اپنی شہرت کے زمانے میں وہ کئی بار نیپلز گیا۔ لیکن لوگوں کے زبردست اصرار کے باوجود کبھی اس شہر میں گانا گانے کے لئے تیار نہیں ہوا۔

شاید اس کی زندگی کے سب سے مسرت آمیز اور عظیم لمحات وہ تھے۔ جب اس نے اپنی بیٹی گلوریا کو سینے سے لگایا تھا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ وہ آج تک اس وقت کے انتظار میں تھا۔ جب یہ بچی برآمدے میں بھاگنے اور اس کے سٹوڈیو کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو جائے۔ ایک روز اٹلی میں جب کاروسو اپنے پیانو کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ تو یہی واقع رونما ہوا۔ اس نے اپنی ننھی بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ اور اشک آلود آنکھوں سے اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا "کیا تمہیں یاد ہے؟۔۔۔ میں صرف اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا۔" اور اس کے ایک ہفتے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

ہیلن جیکسن

وہ ایک دکان پر خواتین کا سامان زیبائش فروخت کرتے کرتے ایک نامور مغنیہ بن گئی

کیا آپ کو عجیب وغریب کہانیاں پسند ہیں؟۔ذیل میں ایک سچی کہانی درج ہے۔ یہ ایک ننھی لڑکی کی کہانی ہے، جسے سب موٹی کے نام سے جانتے تھے۔لیکن بعد میں اس نے ایک مغنیہ کی حیثیت سے سارے یورپ میں اپنا لوہا منوایا۔

یہ ایک ایسی غریب لڑکی کی کہانی ہے۔ جو اس قدر غریب ہوتی تھی کہ موسیقی سیکھنے کی فیس بھی ادا نہ کرسکتی تھی۔اس کے باوجود وہ نیویارک کے میٹروپولیٹن اوپرا کمپنی میں سب سے عمدہ گانے والی تھی۔

1930ء میں یہ لڑکی اپنی آواز کی آزمائش کے لئے کئی دفعہ ریڈیو اسٹیشن گئی۔ لیکن اسے کسی نے ریڈیو پر کوئی پروگرام نہ دیا۔چار برس بعد امریکہ کے ریڈیائی نقاد اسے ریڈیو کی بہترین نئی دریافت خیال کرتے تھے۔

ایک زمانے میں جب میں کولمبیا ریڈیو اسٹیشن سے اپنے پروگرام نشر کیا کرتا تھا۔ تو مجھے ریڈیو اسٹیشن کے سامعین میں سے ایک خوبصورت لڑکی سامنے والی قطار میں اکثر بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی۔بھوری بھوری آنکھوں والی خوب صورت لڑکی۔اس کی شخصیت میں ایک قسم کا طلسم تھا۔جب میں اس سے ملا تو مجھے معلوم ہوا کہ نامور ہیلن

چیسن وہی تھی۔ وہ امریکہ کے مشہور اور بہترین فلوٹ نواز جارج پوسل کی بیوی تھی۔

میں نے جارج سے پوچھا کہ کیا ان کی شادی پہلی نظر میں محبت کا نتیجہ تھی۔ اس نے ہاں میں جواب دیا۔ اتنے میں ہیلن چیسن بھی بول اٹھی۔ جی ہاں مجھے پہلی نظر میں جارج سے محبت ہوئی تھی۔ اسے تو معلوم ہی نہ تھا کہ میں کب سے اسے پیار کرتی چلی آرہی ہوں۔ میں نے برسوں اسے چھپ چھپ کر پیار کیا ہے۔ اسے فقط ایک نظر دیکھنے کے لئے اس کے گھر کا طواف کیا کرتی تھی۔ جب کبھی میں اسے دیکھ لیا کرتی تو ڈر کے بھاگ جایا کرتی۔ میں نے پہلی مرتبہ جارج کو چوتا کالیک میں ایک آرکسٹرا میں دیکھا تھا۔ اس وقت میری عمر فقط بیس برس تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ جارج ان دنوں بتیس برس کا تھا۔ میری اس زمانے میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ لیکن جارج اپنے پیشے کے عروج پر تھا۔ مجھے اس سے اس قدر محبت تھی کہ جب اس نے کسی راستے سے گزرنا ہوتا تو میں درختوں کی اوٹ میں چھپ کر اسے دیکھتی رہتی۔

میں نے ہیلن چیسن سے پوچھا کہ اسے اپنے بارے میں سب سے زیادہ حیرت ناک کون سی بات محسوس ہوتی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ بہت سے لوگ یہ جان کر بے حد حیران ہوتے ہیں کہ میں بیاہتا ہوں اور میری ایک بچی بھی ہے۔

ان کی بچی بھی وہاں موجود تھی۔ جب میں نے اس سے اس کا نام پوچھا تو کہنے لگی کہ میں تین برس کی ہونے والی ہوں۔

یہ تو صحیح ہے، لیکن تمہارا نام کیا ہے؟۔ میں نے دوبارہ اس سے پوچھا ''میں تین برس کی ہونے والی ہوں۔'' بچی نے پھر اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ تو میں نے جان

لیا' مگر تمہارا نام کیا ہے؟۔

مجھے میری سال گرہ پر آئس کریم اور کیک ملیں گے۔ بچی اپنی بنیادی بات پر جمی رہی۔

جب میں نے ہیلن چیسن سے پوچھا کہ کیا وہ توہم پرست بھی ہے، تو اس نے جواب دیا جی نہیں، میں میٹروپولیٹن میں اپنے کمرے میں اکثر سیٹی بجاتی رہتی ہوں ۔حالانکہ گویوں کی بڑی تعداد سیٹی بجانے کو اچھا شگون نہیں سمجھتی۔

اس کے باوجود وہ توہم پرست ہے۔ جب ہسپتال میں اس کے یہاں بچی پیدا ہوئی تو اس نے ایک ریشمی دھاگے میں اس کے نام کا کاغذ پر کر کے اس کے گلے میں باندھ دیا۔ بعد میں ہیلن چیسن نے وہی دھاگہ ایک لاکٹ میں بند کر کے اپنے گلے میں پہن لیا۔ گاتے وقت وہ ہمیشہ اس لاکٹ کو اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔

جب میں نے اس سے پوچھا کہ یہ توہم نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟۔ اس نے جواب دیا یہ ہرگز توہم نہیں ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے۔

اگر ہیلن چیسن نے ایکرون (اوہیو) میں ایک روٹری کلب میں مجھے واپس قدیم ورجینا لے چلو۔ نہ گایا ہوتا تو ممکن ہے دنیائے موسیقی کی ایک بلند شخصیت بننے کی بجائے وہ آج بھی ایک دکان پر خواتین کا سامان زیبائش فروخت کر رہی ہوتی۔

واقعہ یوں ہے کہ اسے ابتدائے زندگی ہی سے مغنیہ بننے کا جنون تھا۔ اس کی ایک خالہ ایک ورائٹی پروگرام میں کام کرتی تھی۔ اور اپنے پرانے کپڑے ہیلن کو دے دیتی تھی۔ ننھی ہیلن چیسن وہ کاسٹیوم پہن کر اچھلا کودا کرتی۔ اور ہمسائے کے دوسرے

بچوں کے ہمراہ "تھیٹر کھیلا کرتی" بعد میں وہ سکول کے ڈرامیٹک کلب کے ترتیب دیئے ہوئے چھوٹے چھوٹے کھیلوں میں کام کرنے لگی۔ تعلیم سے فراغت پا کر اسے ایکروں میں ایک دکان پر خواتین کا سامان زیبائش فروخت کرنے کی ملازمت مل گئی۔ اگرچہ اسے ملازمت پسند نہ تھی۔ لیکن موسیقی دیکھنے کے لئے اسے روپے کی ضرورت تھی۔ وہ ہر اتوار کو گرجے میں مذہبی گیت گانے والی ٹولی میں بھی شریک ہو جاتی۔ اس کے علاوہ وہ کلبوں اور دوسرے سوشل اجتماعوں میں بھی گیت سناتی۔

ایک دن ایک تاجر نے اسے روٹری کلب میں "مجھے واپس قدیم ورجینا لے چلو۔" گاتے ہوئے سن لیا۔ اسے اپنے اسٹور میں ایک ایسی لڑکی کی ضرورت تھی، جو گراموفون ریکارڈ فروخت کر سکے۔ لہذا اس نے ہیلن کو وہ ملازمت دے کر اس کی زندگی کا رخ بدل دیا۔

سٹور میں بیٹھی وہ کئی کئی گھنٹے اپنے پسندیدہ ریکارڈ بجاتی رہتی۔ اور ان کے ساتھ ساتھ خود بھی مشق کرتی رہتی۔ اس زمانے میں وہ نامور موسیقاروں کے ریکارڈ سن کر پہروں سوچا کرتی کہ کیا وہ بھی کبھی اس زمرے میں شامل ہو سکے گی۔ اسے اپنے اس خیال خام پر اکثر ہنسی آتی۔ اور وہ سوچتی کہ وہ کس قدر پاگل ہے۔

اسی زمانے میں فلاڈلفیا میں موسیقی کے ایک ادارے نے موسیقی کے ایک وظیفے کا اعلان کیا۔ اور شوقیہ گانے والی لڑکیوں کو مقابلے میں شرکت کی دعوت دی۔ کیا وہ بھی اس مقابلے میں شرکت کرے؟۔ فلاڈلفیا تک جانے میں اس کی ساری پونجی خرچ ہو جاتی تھی۔ اس مقابلے میں حصہ لینے والی دو سو لڑکیوں میں سے ایک وہ

بھی تھی۔

فرض کیا اگر وہ ناکام رہتی؟۔ اس صورت میں اس کے پاس واپس آنے کے لئے ٹکٹ کے پیسے بھی نہ ہوتے۔ اسے پھر کہیں فلاڈیلفیا میں ملازمت کرنا پڑے گی۔ لیکن اگر وہ کامیاب ہوگی تو ایک طلسمی دنیا کی دہلیز پر جا کھڑی ہوگی۔ لہذا وہ جوا کھیل کر فلاڈیلفیا چلی گئی۔ دوسری دو سولڑکیوں میں سے بعض کی آوازیں اس کی آواز کی طرح صاف، رس بھری اور میٹھی تھی۔ لیکن اس کی آواز میں ایک ایسی چیز تھی۔ جو دوسروں میں نہ تھی۔ اس کی آواز میں سوز تھا۔ وہ اپنے گیت مقبول عام بنا سکتی تھی۔ اسی اثناء میں اسے ایک جج نے دیکھ لیا۔ کہ ہیلن نے اپنا ایک موزہ بڑی صفائی سے رفو کیا ہوا ہے۔ وہ جج ایسی لڑکیاں پسند کرتا تھا، جن میں کوئی کام صفائی سے کرنے کی صلاحیت ہو۔ لہذا ہیلن چیسن نے مقابلہ جیت لیا۔

ہیلن اور ایک اور لڑکی نے شہر کے مضافات میں کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ انہیں کام پر آنے کے لئے روزانہ چار میل کا سفر پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ اور سردیوں میں وہ خود کو گرم کرنے کے لئے ایک دوسرے کے پاؤں پر پاؤں رکھ کر رقص کیا کرتیں۔ وہ شمعیں جلا کر انہیں فرش پر رکھ دیتیں اور انہیں آتش دان تصور کرتیں۔ ان کے پاس خوراک پر خرچ کرنے کے لئے فقط دو شلنگ یومیہ ہوتے تھے۔ لہذا وہ ایک چھوٹے سے سٹوو پر اپنا کھانا خود ہی پکایا کرتی تھیں۔ بعض اوقات وہ صرف شوربے پر گزارا کرتیں، لیکن وہ گیت گاتیں اور خود کو پیرس میں تصور کرتیں۔ آپ اسے تنگ دستی کہیں گے بالکل نہیں، وہ اپنی منزل کی طرف رواں تھیں۔

ہیلن چیسن میں مجھے سب سے زیادہ قابل تعریف یہ بات دکھائی دی کہ دولت اور شہرت نے اس کا دماغ خراب نہیں کیا۔ وہ آج بھی اسی زمانے کی طرح منکسر المزاج ہے۔ جب وہ اپنے والد کے گھر میں برتن اور فرش صاف کیا کرتی تھی۔

☆☆☆

لارنس ٹبٹ

جب وہ سکول کی کسی تقریب میں گانے کی کوشش کرتا تو لڑکے اس کا مذاق اڑاتے۔ آج وہ گانے کا معاوضہ ایک پونڈ فی سیکنڈ لیتا ہے۔

1922ء میں لارنس ٹبٹ لاس اینجلس کے قریب بہت برے دن گزار رہا تھا۔ اسے اپنے بیوی اور بچوں کا خرچ چلانے کے لئے سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ اتوار کے اتوار چرچ میں مذہبی گیت گاتا اور کبھی کبھی کسی شادی پر "مجھ سے وعدہ کرو" گا کر تھوڑے بہت پیسے حاصل کر لیتا۔

وہ کئی برس تک موسیقی سیکھتا رہا مگر سب بے سود۔ آخر اس کے ایک دوست روپرٹ ہگز نے اسے ایک دن مشورہ دیا کہ "تمہاری آواز میں ایک خاص جاذبیت ہے تم نیویارک جا کر تقدیر آزماؤ۔"

یہ ذرا سی دوستانہ حوصلہ افزائی لارنس ٹبٹ کی زندگی میں ایک انقلاب کا سبب بنی۔ اس نے پانچ سو پونڈ قرض لیے اور نیویارک کی جانب چل پڑا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اگر وہ نیویارک میں بھی ناکام رہا تو واپس کیلی فورنیا آ کر ٹرکوں کی فروخت کرنے کا کام شروع کر دے گا۔

وہ 1922ء کا زمانہ تھا۔ کیا لارنس ٹبٹ آج ٹرک فروخت کرتا ہے۔؟۔ ہرگز نہیں وہ ہالی وڈ میں فلموں میں گیت گاتا ہے۔ اور ان کا بہت بڑا معاوضہ لیتا ہے۔

ممکن ہے آپ نے "روج سانگ" "نیومون" اور "کیوبن لوسانگ" جیسی فلموں میں اس کا گانا سنا ہو۔

اگر اب کبھی آپ کو اس کی آواز سننے کا اتفاق ہو تو یہ بات آپ کے لئے دل چسپی سے خالی نہ ہو گی کہ وہ ایک منٹ گانے کا معاوضہ ساٹھ پونڈ لیتا ہے۔ یعنی فی سیکنڈ ایک پونڈ۔

1922ء میں لارنس ٹبٹ اس قدر غریب تھا کہ اس میں سکت نہ تھی کہ شہر کے اندر مکان لے سکے۔ لہذا اس نے ایک گاؤں میں کرائے پر مکان لے رکھا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ مکان انگوروں کے ایک باغ میں واقع تھا۔ اسے حسب خواہش مفت انگور کھانے کی اجازت تھی۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ بعض اوقات اس کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہ ہوتا، اور اس کے بچے مفت انگوروں پر گزراوقات کیا کرتے تھے۔ مکان کا ماہانہ کرایہ دو پونڈ دس شلنگ تھا۔ لیکن ایک موسیقار کی حیثیت سے اس کی آمدنی اس سے بھی کم تھی۔ ایک دفعہ اس پر دس ماہ کا کرایہ ہو گیا، اور اس نے انگور توڑنے اور شراب کشید کرنے کی ملازمت کر کے یہ کرایہ چکایا۔

اس نے ایک پاونڈ ماہوار کرائے پر ایک پیانو لیا، لیکن اس کے مکان اور کمروں کی ساخت کچھ اس قسم کی تھی کہ وہ اسے وہاں نہ لا سکتا تھا۔ اس کا مکان ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ اور ایک کمرے کا سامنے والا حصہ کھلا تھا۔ اگر پیانو اس کمرے میں لا کر رکھا جاتا اور کسی دن اسے ذرا سی بھی دھکا لگ جاتا تو اس نے ٹیلے سے نیچے گر جانا تھا۔

جب وہ پہلے پہل نیو یارک آیا تو اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ

میٹروپولیٹن اوپرا ہاؤس کے عقب میں کھڑا ہو کر شو دیکھتا رہتا۔ ان دنوں وہ اپنے کمرے کا کرایہ اور موسیقی سیکھنے کی فیس ادا کرنے کے لئے اپنے ایک دوست سے روپیہ ادھار لیا کرتا تھا۔

اس کے باوجود دس برس بعد جب وہ میٹروپولیٹن اوپرا ہاؤس کے عظیم الشان سٹیج پر آتا تو تماشائی جوش سے تالیاں بجانے لگتے۔ وہ دنیا کا نامور مغنی بن چکا تھا۔

نیویارک میں ہر برس سینکڑوں خوش آواز نوجوان شہرت حاصل کرنے کی آرزو لیے آتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ اس سلسلے میں جب میں نے لارنس ٹبٹ کی رائے پوچھی تو اس نے کہا کہ ہزار میں سے نوسو ننانوے نوجوان ناکام ہوتے ہیں۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ ان کی آواز اچھی نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کو اپنی آواز کے اتار چڑھاؤ پر اختیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنی آواز موثر نہیں بنا سکتے۔ اور نہ ہی ان کی آواز لوگوں کے دل میں اترتی ہے۔

لارنس ٹبٹ کا بچپن بیکر فیلڈ (کیلی فورنیا) میں گزرا۔ اس کا والد کیلی فورنیا میں ''کاؤبوائے تھا'' سماج دشمن عناصر سے اس کا اکثر جھگڑا رہتا۔ اس لئے وہ ہمیشہ اپنی کمر کے ساتھ پستول لگائے رکھتا تھا۔

اس کا نشانہ بے حد اچھا تھا۔ اس نے ایک خوف ناک قسم کا جاسوسی کتا بھی پال رکھا تھا۔ وہ اپنے مکان کے عقبی صحن میں زنجیر سے باندھے رکھتا۔ اس کتے کا نام راڈ تھا۔ جب کہیں کوئی چوری ہوتی تو اسے چوروں کا کھوج لگانے کے لئے بلایا جاتا۔ اس کا والد جائے حادثہ پر پہنچ کر کتے کی زنجیر کھول دیتا۔ اور خود اس کے پیچھے پیچھے

چل پڑتا۔ کتا کھیتوں اور باغوں میں سے زمین سونگھتا چلا جاتا، اور اس کے پیچھے اس کا مالک ہوتا۔ ساتھ ساتھ وہ یہ الفاظ بھی دہراتا رہتا۔ "اب کے راؤ اسے پکڑ کر رہے گا۔" لیکن اکثر یوں ہوتا کہ راؤ کسی چور کو پکڑنے کی بجائے کسی گائے یا گھوڑے پر حملہ آور ہو جاتا۔

لارنس جبٹ کو یہ زندگی بے حد پسند تھی۔ اس لئے بچپن میں اس نے اپنے والد جیسی زندگی اختیار کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

لیکن اچانک ایک ڈرامائی اور المیہ واقعہ رونما ہو گیا۔ ڈاکوؤں کی ایک لڑائی میں اس کا والد گولی سے مارا گیا۔

اس حادثے نے لارنس جبٹ کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ اس کا والد بے حد مذہبی تھا۔ وہ رقص، گانے اور تمباکو نوشی وغیرہ کے سخت خلاف تھا۔ اس نے نہ تو کبھی اپنے لڑکے کو تاش کھیلنے دی تھی اور نہ ہی کبھی کسی تھیٹر جانے دیا تھا۔ لارنس جبٹ نے مجھے بتایا کہ اگر اس کا والد ہلاک نہ ہوتا تو اس کی موجودگی میں بھلا وہ کیسے ایک ایکٹر یا گویا بن سکتا تھا۔ اس کے والد کی تربیت کا اثر ابھی تک اس پر تھا۔ اب بھی وہ سال میں ایک آدھ بار ہی سگرٹ پیتا تھا۔ اور ساتھ ہی اسے ایک دم یہ احساس ہونے لگتا کہ وہ کوئی غلط کام کر رہا ہے۔ اور شیطان اس کے قریب کھڑا اسے اس بات کی ترغیب دے رہا ہے۔

سکول کے زمانے میں لارنس جبٹ انتہائی احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ اس کی والدہ ایک بورڈنگ ہاؤس چلاتی تھی۔ اس کے پاس فقط ایک سوٹ ہوتا تھا۔ اور اس

کے پاس اتنے پیسے نہ ہوتے کہ وہ اپنی کسی گرل فرینڈ کو آئس کریم کھلا سکے۔ دوسرے لڑکے اس کا مذاق اڑاتے اور اسے خاطر میں نہ لاتے۔ آخر اس نے اپنی حیثیت منوانے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے سکول کی مجلس میں موسیقی میں حصہ لینا چاہا۔ لیکن دوسرے لڑکوں نے وہاں اس کی دال نہ گلنے دی۔ اس نے سکول کے ایک ڈرامے میں شرکت کرنا چاہی۔ مگر کسی نے اسے کوئی رول نہ دیا۔ ایک دفعہ جب اس نے سکول کے ایک کنسرٹ میں گانا چاہا تو دوسرے لڑکے اس کا مذاق اڑانے لگے۔ اکیس برس کی عمر سے پہلے اس کی آواز کے شعلے کم چمک کسی نے نہ دیکھی تھی۔ ''جو آپ کا رواں رواں کھڑا کر دے اور آپ کے دل کے تار کو چھیڑتا ہوا آپ کی روح میں اتر جائے۔''

لارنس ٹبٹ کے نزدیک ایک اچھے دن کا اختتام'' ہر دور کا ایک مقبول ترین گیت ہے۔ اس کا یقین ہے کہ ''اولڈ مین ریور'' اور ''بلیو ریپوڈی'' فن موسیقی کے بہترین شاہکار ہیں۔



مادام ارنسٹائن سکو مان ہینک

فاقوں سے تنگ آ کر اس نے خودکشی کی کوشش کی، اور دنیا کی نامور مغنیہ بن گئی

مادام ارنسٹائن سکو مان ہینک نے کس طرح مسلسل بھوک، حوصلہ شکنیوں اور مایوسیوں کا مقابلہ کر کے خود کو دنیائے موسیقی کی ایک بلند مغنیہ منوایا۔ یہ کہانی رقص گاہوں کے ماحول اور فلمی زندگی کی ایک غیر معمولی کہانی ہے۔

کامیابی کے لئے اس کی جدوجہد تلخ اور سخت تھی۔ اس پر ایک ایسا دور بھی آیا کہ اس نے خود کو ہر طرف سے مایوسیوں میں گھرا ہوا دیکھ کر خودکشی کی کوشش کی۔ اس کی شادی ایک المیہ ثابت ہوئی۔ اس کا شوہر اسے مقروض چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا تھا۔ جرمنی میں اس زمانے کے قانون کے تحت ایک بیوی اپنے شوہر کے قرضوں کو چکانے کی ذمہ دار ہوتی تھی۔ اس کے قرض خواہ ماسوائے ایک کرسی اور ایک بستر کے گھر کی ہر شے لے گئے۔ جب کبھی اسے یہاں وہاں گانے کی چھوٹی موٹی ملازمت ملتی تو قرض خواہ دوبارہ آ دھمکتے اور اس کی مزدوری میں سے بڑا حصہ لے جاتے۔

اپنے تیسرے بچے کی پیدائش سے چھ گھنٹے قبل وہ ایک جگہ گا رہی تھی۔ اس وقت درد سے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔ لیکن وہ گانے پر مجبور تھی۔ کیونکہ اسے اپنے بچوں کا پیٹ پالنا تھا۔ سردیوں میں اس کے بچے بھوک اور سردی سے بلبلاتے۔ لیکن

اس کے پاس اتنے پیسے نہ ہوتے کہ کوئلہ وغیرہ خرید کر کمرہ گرم کر سکے۔

آخر مایوسی سے تنگ آ کر نیم دیوانگی کی حالت میں اس نے خود کو اور اپنے تینوں بچوں کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن خودکشی کرنے کی بجائے اس نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اور ایک روز دنیا کی ایک نامور مغنیہ بن گئی۔

اپنی موت سے چند ماہ قبل اس نے مجھے شکاگو اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا۔ اور وعدہ کیا کہ وہ کھانا خود اپنے ہاتھ سے تیار کرے گی۔ پھر اس نے کہا کہ اگر آپ یہ کہنے آئے ہیں کہ میں ایک عظیم مغنیہ ہوں تو میں بھی آپ کو پسند کرنے لگوں گی۔ لیکن کھانا کھانے کے بعد اگر آپ نے یہ کہا کہ مادام ارنسٹائن سکومان ہینک، اس سے بہتر اور مزے دار کھانا میں نے آج تک نہیں کھایا" تو اس صورت میں آپ مجھے زندگی بھر ایک بہترین دوست پائیں گے۔

اس نے مجھے بتایا کہ ایک مغنیہ کی حثیت سے اس کی کامیابی کے رازوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ لوگوں سے محبت کرتی تھی۔ مذہب نے اسے لوگوں سے پیار کرنا سکھایا تھا۔ وہ ہر روز مقدس بائبل پڑھتے۔ اور خدا کے حضور گھٹنوں کے بل جھک کر ہر روز دعا مانگتی تھی۔

اس نے مجھے بتایا کہ زندگی کے المیوں نے بھی اس کی مدد کی تھی۔ دکھوں نے اس کے اندر ہمدردی، ایثار اور خلوص کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اس کے غموں نے اس کی آواز میں ایک ایسا جادو بھر دیا تھا کہ جو لاکھوں دلوں میں اتر جاتا تھا۔ اگر آپ نے کبھی اس کا

کوئی گیت سنا ہے تو آپ یقیناً اس کی آواز کے سوز سے واقف ہوں گے۔

یہ جانتے ہوئے کہ اسے اپنے بچوں سے کس قدر محبت تھی، میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے خود کو اور اپنے بچوں کو ہلاک کرنے کی کوشش کیوں کی تھی۔ اس پر اس نے مجھے ذیل کا واقعہ سنایا:

میں فاقہ زدہ، بیمار اور دل شکستہ تھی۔ اس نے کہا کہ مجھے مستقبل میں بھی امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری طرح میرے بچے بھی فاقوں کا شکار ہوں۔ میں نے سوچا کہ یوں زندگی گزارنے سے تو موت ہی بھلی ہے۔ لہذا میں نے خود کو اپنے بچوں کو ٹرین کے نیچے ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سارا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ مجھے گاڑی کے گزرنے کا وقت معلوم تھا۔ بچے بھوک سے بلبلاتے، میرے پہلو میں گاڑی کی لائن کی طرف چل رہے تھے۔ پھر مجھے گاڑی کی وسل سنائی دی۔ میں گاڑی کی لائن کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے بچوں کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اور گاڑی کی لائن پر لیٹ گئی۔

ابھی میں لائن پر لیٹی ہی تھی کہ میرے ساتھ لیٹی ہوئی میری سب سے چھوٹی بچی نے میری طرف سر پھیر کر کہا۔ ''امی جان مجھے آپ سے بڑا پیار ہے، دیکھئے یہاں کس قدر سردی ہے۔ مجھے گھر لے چلیں۔''

بچی کی آواز سن کر میں ہوش میں آ گئی۔ میں نے جلدی سے اپنے تینوں بچے لائن سے اٹھائے۔ اور سرد ویران گھر کی طرف چل دی۔ گھر آ کر میں گھٹنوں کے بل خدا کے حضور جھک گئی اور دیر تک رو رو کر خلوص سے دعا مانگتی رہی۔

اس وقت تک مادام ارنسٹائن سکو مان ہینک نے زندگی میں جو کام بھی کیا تھا۔ اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔لیکن خودکشی کی اس کوشش کے چند سال بعد برلن کا رائل اوپرا ہاؤس، لندن کا کانوینٹ گارڈن اور نیو یارک میٹرو پولیٹن اس کی خدمات حاصل کرنے کے لئے بے تاب تھے۔ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر اسے معاوضہ دینے کو تیار رہتے تھے۔ اس نے برسوں تنگ دستی میں زندگی گزاری تھی۔ کامیابی نے برق رفتاری سے اس کے قدم چومے۔ یہی اس کا دستور ہے۔

مادام ارنسٹائن سکو مان ہینک کا والد ایک آسٹرین آفیسر تھا۔ اس کی تنخواہ کم مگر کنبہ بڑا تھا۔ اس طرح بچپن ہی سے ارنسٹائن بھوک کی تکلیف سے واقف تھی۔ اگر کسی روز اسے پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا تو وہ خدا کا شکر ادا کرتی۔ مکھن وغیرہ کی اس نے کبھی شکل نہ دیکھی تھی۔ جب وہ سکول جاتی تو اپنے ہمراہ چائے کی ایک پیالی اور ایک سوکھی روٹی دوپہر کے کھانے کے طور پر لے جاتی۔ رات کے کھانے پر بھی اسے سوکھی روٹی اور چائے ہی ملا کرتی تھی۔

پیٹ بھر کر کھانا حاصل کرنے کی خاطر وہ سکول بند ہونے سے تھوڑی دیر پہلے چوری چھپے بھاگ آتی۔ اور قصبے کے باہر چڑیا گھر میں بندروں کے پنجرے صاف کرنے لگتی۔ چڑیا گھر کا منیجر اسے معاوضے کے طور پر تھوڑے سے سینڈوچ دے دیتا۔

موسیقی کے کئی برس مطالعہ اور مشق کے بعد اسے ایک موقع ملا کہ وی آنا کی نام ور امپریل کمپنی کی ڈائریکٹر کو اپنا گانا سنا سکے۔

اس کا گانا سننے کے بعد کمپنی کے ڈائریکٹر نے اس سے کہا کہ وہ کبھی ایک

کامیاب مغنیہ نہیں بن سکتی۔ اس کی نہ تو کوئی شخصیت ہے اور نہ ہی خدوخال اچھے ہیں۔ لہذا اس کے لئے بہتر ہوگا کہ گانے کا خیال دل سے نکال دے۔ اور سلائی مشین خرید کر لوگوں کے کپڑے وغیرہ سیا کرے۔

کئی برس بعد جب وہ دنیا کی ایک نامور مغنیہ بن چکی تھی تو اسے وی آنا کی امپریل اوپرا کمپنی میں گانے کے لئے مدعو کیا گیا۔ اس کے شاندار اور کامیاب پروگرام پر ڈائریکٹر نے اسے مبارکباد دی اور کہا کہ آپ کا چہرہ کچھ مانوس نظر آتا ہے۔ میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے؟۔

''جب میں نے اس سے پہلی ملاقات اور سلائی مشین خرید کر لوگوں کے کپڑے سینے کے مشورے کے متعلق بتایا تو وہ بے حد حیران اور شرمندہ ہوا۔''



راہنما

تھیوڈور روزویلٹ

وہ وائٹ ہاؤس میں اپنے سرہانے بھرا ہوا پستول رکھ کر سویا کرتا تھا۔

جنوری 1919ء کو ایک ایسا واقعہ رونما ہوا۔ جسے میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ اس وقت میں فوج میں تھا اور ہماری بٹالین لانگ آئی لینڈ پر کیمپ پٹون میں مقیم تھی۔ ایک دوپہر کو فوج کا ایک دستہ قریبی پہاڑی کے اوپر گیا۔ سپاہیوں نے اپنی رائفلیں ہوا میں بلند کیں اور سلامی گولیاں چلانے لگے۔ امریکہ کا صدر روزویلٹ دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ تھیوڈور روزویلٹ جس کا شمار امریکہ کے بہترین صدور میں ہوتا ہے۔ وہ نسبتاً جوان فوت ہوا تھا۔

تھیوڈور روزویلٹ کی تقریباً ہر بات غیر معمولی تھی۔ مثلاً اگرچہ اس کی بینائی اس قدر کمزور تھی کہ عینک کے بغیر وہ دس فٹ کے فاصلے پر بھی اپنے بہترین دوست کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس کا نشانہ اتنا اچھا تھا کہ اس نے افریقہ کے جنگلوں میں حملہ آور شیروں کو گولی کا نشانہ بنا دیا اور موت کی نیند سلا دیا۔

اس کا شمار بڑا شکار کرنے والے بہترین شکاریوں میں ہوتا ہے۔ لیکن اس نے نہ تو کبھی مچھلی کا شکار کیا اور نہ ہی کسی پرندے پر گولی چلائی تھی۔

لڑکپن میں وہ اکثر بیمار رہتا تھا۔ اسے دمے کی شکایت تھی۔ لہٰذا اپنی صحت کی بحالی کے لئے مغربی امریکہ چلا گیا اور وہاں کا ذبوائے بن گیا۔ وہاں وہ کھلے آسمان

تلے ستاروں کی چھاؤں میں سویا کرتا تھا۔ آخر اس کی صحت اس قدر اچھی ہوگئی کہ وہ مشہور ملہ باز مائک ڈونووان سے اکثر ملہ بازی کا مقابلہ کرتا۔ وہ جنوبی امریکہ کے جنگلوں میں گھوما کرتا۔ دشوار گزار پہاڑوں پر چڑھتا۔ اور کیوبا میں گولیوں کی بوچھاڑ میں سان جوان پہاڑی پر حملہ آور رہوا۔

روزویلٹ نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ بچپن میں وہ بڑا اعصاب زدہ اور مسکین ہوتا تھا۔ اور زخمی ہونے سے بے حد ڈرتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنے کندھے، بازو، ناک، پسلیاں اور کلائی توڑیں۔ اور پھر بھی خطرے میں کودنے سے نہ گھبراتا تھا۔ جب وہ ڈیکوٹا میں کاؤبوائے تھا تو اکثر اپنے گھوڑے پر سے گر کر کوئی نہ کوئی ہڈی پسلی تڑوالیتا تھا۔ اس کے باوجود اسی حالت میں دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر مویشی ہانکنے لگتا۔

وہ لکھتا ہے کہ جس کام سے وہ ڈرتا تھا۔ اسی کو انجام دینے سے اس میں جرات پیدا ہوئی۔ وہ خود کو یوں ظاہر کرتا کہ جیسے اسے موت سے مطلق ڈر نہیں لگتا۔ آخر وہ اس قدر جرات مند ہوگیا کہ گرجتے ہوئے شیر اور آتشیں توپوں کے دہانے بھی اس کی جرات کو متزلزل نہ کرسکتا تھا۔

1912ء میں الیکشن کی تحریک کے دوران میں ایک نیم پاگل شخص نے اس کے سینے میں گولی ماردی۔ وہ تقریر کرنے کے لئے کہیں جارہا تھا۔ روزویلٹ نے کسی کو پتا نہ چلنے دیا کہ گولی اسے لگی ہے۔ وہ اسٹیج پر گیا، اور اس وقت تک تقریر کرتا رہا۔ جب تک زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوش نہ ہوگیا۔ تب اسے اٹھا کر

ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

وائٹ ہاؤس میں رہائش کے دوران وہ اپنے تکیے کے نیچے بھرا ہوا پستول رکھ کر سوتا تھا۔ اور جب سیر کے لئے نکلتا تو اپنے ساتھ ایک چھوٹا پستول لے کر نکلتا تھا۔

جب وہ فوجی افسر تھا تو ایک فوجی افسر اس سے اکثر مکہ بازی کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس فوجی افسر نے اس کی بائیں آنکھ پر مکہ مارا۔ جس سے خون کی ایک نس پھٹ گئی، جس سے اس کی نظر مستقل طور پر کمزور ہو گئی۔ لیکن تھیوڈور روزویلٹ نہیں چاہتا تھا کہ اس فوجی افسر کو معلوم ہو، اور اسے اپنے کیے پر افسوس ہونے لگے۔ لہذا جب اس افسر نے اگلی دفعہ اسے باکسنگ کے لئے کہا تو روزویلٹ نے انکار کر دیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ عمر کے اس حصے میں اب اسے اس قسم کی کھیلوں میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ کئی برس بعد اسے اس آنکھ سے دکھائی دینا بالکل بند ہو گیا۔ لیکن اس نے اس فوجی افسر کو کبھی یہ معلوم نہ ہونے دیا کہ یہ اس کی وجہ سے تھا۔

اس نے کبھی سگرٹ نہ پیا۔ اس نے کبھی قسم نہ کھائی تھی۔ شراب بھی کبھی نہ پی تھی۔ کبھی کبھی خاص مواقع پر ملک شیک میں تھوڑی سی برانڈی ملا کر پی لیتا۔ اس کے باوجود اس کے بدخواہ اسے پکا شرابی کہا کرتے تھے۔ آخر ان کی زبان کو لگام دینے کے لئے اسے ان کے خلاف قانونی اور عدالتی کاروائی کرنا پڑی۔

خواہ وہ کتنا ہی مصروف کیوں نہ ہوتا۔ وہ مطالعہ کے لئے وقت نکال لیتا۔ اس نے وائٹ ہاؤس میں رہ کر ہزاروں کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اکثر دوپہر کے بعد بیسیوں لوگ اس کے انٹرویو کو آتے۔ وہ اپنی گود میں ایک کتاب رکھے بیٹھا رہتا، اور ہر

انٹرویو کے بعد جو چند سیکنڈ ملتے، اس میں کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتا تھا۔

جب وہ سفر پر جاتا تو اپنی جیب میں شیکسپیئر یا روبی برنز کی کوئی نہ کوئی کتاب ضرور رکھتا۔ ایک دفعہ جب وہ ڈیکوٹا میں گھوڑوں کی رکھوالی کر رہا تھا۔ تو اس نے اپنے ساتھی کو پورا ''ہملٹ'' پڑھ کر سنا دیا۔ برازیل کے جنگلات میں سفر کرتے ہوئے وہ اپنی راتیں گبن کی ''زوال سلطنت روما'' پڑھنے میں بسر کیا کرتا تھا۔

اسے موسیقی سے پیار تھا۔ لیکن اس نے جب بھی کبھی بذات خود گانے کی کوشش کی۔ سخت ناکام رہا۔ ایک دفعہ وہ مغربی امریکہ کے ایک شہر کے بازاروں میں سے گزر رہا تھا۔ ہزاروں لوگ اس کے استقبال کے لئے جمع تھے۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر انہیں سلام کر رہا تھا۔ اور زیر لب یہ گنگناتے جا رہا تھا۔ ''میرا خدا میرے نزدیک ہے۔''

اس کی بہت سی ہابیز تھیں۔ ایک دفعہ اس نے ایک نامور اخبار کے نمائندے کو وائٹ ہاؤس آنے کی دعوت دی۔ اس اخباری نمائندے نے سمجھا کہ شاید وہ اس سے کوئی اہم بات کرنے والا ہے۔ لہذا اس نے اخبار کے ایڈیٹر کو بذریعہ تار مطلع کیا۔ کہ وہ اس اہم خبر کا انتظار کرے۔ اور اس وقت تک اخبار کی کاپیاں پریس میں نہ جانے دے۔

جب وہ اخباری نمائندہ وائٹ ہاؤس پہنچا تو تھیوڈور روز ویلٹ نے اس سے سیاست کے بارے میں ایک بات بھی نہ کہی۔ اس کے برعکس اس نے ایک پرانے درخت کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہاں اس نے الووں کا ایک نیا جوڑا تلاش کیا ہے۔

ایک دفعہ وہ اپنی کار میں کہیں جا رہا تھا۔ اچانک اس نے کھیتوں میں ایک کسان کو دیکھا جو ہاتھ ہلا کر اسے سلام کر رہا تھا۔ تھیوڈور روزویلٹ نے فوراً کار روک لی۔ کار سے اترا اور بڑی گرم جوشی سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔ یہ کوئی سیاسی ڈھونگ نہیں تھا۔ اسے حقیقتاً اپنے عوام سے بے حد محبت تھی۔

زندگی کے آخری ایام میں اس کی صحت گرنے لگی۔ اگرچہ وہ فقط ساٹھ برس کا تھا لیکن اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ بوڑھا ہو رہا ہے۔ ایک دفعہ اس نے اپنے ایک پرانے دوست کو لکھا کہ ”تم اور میں اب موت کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے ہیں۔“ ہم کسی وقت اس میں گر سکتے ہیں۔

14 جنوری 1919ء کو وہ سویا سویا بڑے آرام سے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی زبان سے آخری الفاظ یہ نکلے تھے۔ ”روشنی گل کر دو۔“



ووڈرو ولسن

وہ دوست بنانے کا خواہش مند تھا مگر اس نے ہزاروں دشمن بنا لیے۔

ووڈرو ولسن حقیقت میں کس قسم کا انسان تھا؟۔

اسے اعلٰی درجے کا ذہین انسان کہا جاتا ہے۔ لیکن اسے ناکام ترین شخص بھی گروانا جاتا ہے۔

اسے عالمی امن کی ایک تدبیر سوجھی تھی۔۔۔ لیگ آف نیشن۔۔ اسے کامیاب بنانے کے لئے اس نے اپنی تمام تر قوتیں صرف کر دیں۔ آخر وہ مر گیا۔ ایک تباہ حال انسان جسے اس کے اپنے نظریے نے موت کی نیند سلا دیا۔

جب 1919ء میں ووڈرو ولسن یورپ کے لئے روانہ ہوا تو اسے انسانیت کا نجات دہندہ کہا جاتا تھا۔ لہو سے لت پت یورپ نے ایک دیوتا کی طرح اس کا استقبال کیا۔ بھوکے کسان اس کی تصویر کے آگے شمعیں جلا کر اس طرح اس کی عبادت کرتے جیسے وہ کوئی مقدس ہستی ہو۔

ساری دنیا اس کے قدموں میں پڑی تھی۔ لیکن جب تین ماہ بعد خستگی و درماندگی کی حالت میں وہ امریکہ واپس آیا تو اس کے بہت سے دوست اس سے بدگمان ہو چکے تھے۔ اور اس نے اپنے لئے ہزاروں دشمن بنا لیے تھے۔

تاریخ ووڈرو ولسن کو ایک صحیح اسکول ماسٹر کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ سرد مہر،

بارعب اور انسانی جذبات سے محروم ایک سکول ماسٹر۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ولسن ایک صحیح انسان تھے۔ انسانی تعلقات کا بھوکا۔ یہ اس کی زندگی کا المیہ تھا کہ اس کے اپنے شرمیلے پن نے اسے دوسروں سے الگ تھلگ رکھا۔

لیکن بعض اوقات وہ غیر متوقع طور پر کھل جاتا۔ مثلاً ایک دفعہ یونیورسٹی کے دنوں میں وہ کھیل کے میدان میں فٹ بال کے کھلاڑیوں کو بڑے جوش وخروش سے داد دیتا رہا۔ جب وہ برمودا میں تھا تو ایک دفعہ کشتی کی سیر کے دوران وہ حبشی ملاحوں سے دیر تک گپیں ہانکتا رہا۔

میرے خیال میں ووڈرو ولسن امریکہ کے تمام صدروں میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ اس کے باوجود اس نے گیارہ سال کی عمر تک لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا۔ وہ تفریح طبع کے لئے اکثر جاسوسی کہانیوں کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتا تھا۔

یہ اعلیٰ دماغ والا پروفیسر جس نے اپنی زیادہ تر زندگی عالمانہ ماحول میں بسر کی۔ اکثر بلاتکلف کہا کرتا تھا کہ وہ شکسپیئر کا کوئی ڈرامہ دیکھنے کی بجائے موسیقی کا کوئی شو دیکھنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ وہ کہا کرتا کہ وہ تھیٹر نکتہ چینی کے لئے نہیں بلکہ تفریح کے لئے جاتا تھا۔ جب وہ امریکہ کا صدر تھا تو اکثر ورائٹی شو دیکھنے جایا کرتا تھا۔

اس نے اپنی بیشتر زندگی مفلسی میں گزاری۔ ایک استاد کی حیثیت سے اس کی تنخواہ اس قدر کم تھی کہ گھر چلانے کے لئے اس کی بیوی کو تصویریں بنا کر فروخت کرنا پڑتی تھیں۔

ایک نوجوان پروفیسر کی حیثیت سے ووڈرو ولسن کو کبھی اتنی توفیق نہ ہوئی تھی کہ

اچھے کپڑے خرید سکے۔ بعد کی زندگی میں اس نے لنکن کی طرح کبھی اپنے لباس کی پرواہ نہ کی تھی، مثلاً ایک دفعہ جب وہ صدر تھا تو اس کے سیکرٹری نے ایک دفعہ اس سے کہا کہ وہ اپنے کوٹ کی استر کی تبدیلی کے لئے اسے درزی کو دے دے۔ لیکن ووڈرو ولسن نے جواب دیا۔ ''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ابھی ایک سال نکل سکتا ہے۔''

لنکن کی طرح ووڈرو ولسن اپنی خوراک سے بھی بے اعتنائی برتتا تھا۔ اس کے آگے جو کچھ رکھ دیا جاتا تھا۔ کھا لیتا۔ لیکن بعض دفعہ بے دھیانی میں اسے یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ کیا کھا رہا ہے؟۔

اس نے اپنی زندگی میں فقط ایک بار سگار پیا اور اسے بھی ختم ہونے سے پہلے بیزاری کے عالم میں پھینک دیا۔

خوب صورت کتابوں سے اس کی طبیعت کبھی نہ بھرتی تھی۔ وہ ہمیشہ اچھی اچھی کتابیں خریدتا تھا۔

اس کے ظاہری سرد مہر اور اکھڑ ڈھانچے کے نیچے آتشیں جذبات کا ایک لاوا ابلتا رہتا تھا۔ جن لوگوں نے اسے قریب سے دیکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ روزویلٹ سے زیادہ گرم مزاج تھا۔ اپنی پہلی بیوی سے اسے بے حد محبت تھی۔ صدر بننے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی بیوی کو ایک خوب صورت گرم کوٹ خرید کر دیا۔ ایک برس بعد جب وہ فوت ہو گئی تو اس نے 72 گھنٹے تک اس کی نعش اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دی۔ وہ نعش کو تین دن اور تین راتیں صوفے پر ڈالے اس کے

قریب بیٹھا رہا۔

اسے ایک علمی دیو کہا جاتا تھا۔ لیکن اسے زبان پر بہت کم عبور تھا۔ اور وہ دنیا کے بہت سے عظیم ادب سے ناواقف تھا۔ سائنس سے اسے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ اور فلسفہ تو اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

اس نے اپنی زندگی کا آغاز ایک وکیل کی حیثیت سے کیا تھا۔ لیکن اس پیشے میں اسے سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وکالت کے سارے عرصے میں اس کے پاس فقط ایک مقدمہ آیا۔ اور وہ بھی اس کی والدہ کی جائیداد کے متعلق تھا۔

میرے خیال میں ولسن کے کردار میں سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اسے کامیاب ہونے کے مختلف گر نہ آتے تھے۔ بچپن ہی سے اس کی زبردست خواہش تھی کہ وہ سیاست دان بنے۔ وہ کئی کئی گھنٹے اپنے کمرے میں تقریر کرنے کی مشق کیا کرتا تھا۔ اس فن پر عبور حاصل کرنے کے لئے وہ عجیب وغریب حرکتیں کیا کرتا تھا۔ مثلاً اس نے چہرے کے اتار چڑھاؤ کے سلسلے میں اپنے کمرے کی ایک دیوار سے مختلف قسم کے چارٹ آویزاں کر رکھے تھے۔ لیکن وہ ایک اہم چیز کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتا تھا۔ اسے لوگوں سے برتاؤ کا طریقہ کبھی نہ آیا۔ زندگی کے آخری برسوں میں اس نے اپنے بہت سے احباب سے تعلقات خراب کر لیے تھے۔ وہ سینٹ کے لیڈروں سے جھگڑ پڑا۔ اس نے اپنے بہترین دوست کولونل ہاؤس سے بھی تعلقات منقطع کر لیے۔ آخر جب اس نے ڈیموکریٹ امیدواروں کو ووٹ دینے کے لئے عوام سے کہا، تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس کے خلاف ہو گئی۔

جب سینٹ نے لیگ آف نیشن کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ تو ولسن نے بلا واسطہ عوام سے اپیل کی۔ اس کی صحت ہمیشہ سے خراب تھی۔ اس کے ڈاکٹروں نے اسے زیادہ کام نہ کرنے کی تنبیہ کی تھی۔ لیکن اس نے ان کا مشورہ نظر انداز کر دیا۔

صدر کی حیثیت سے اس کا آخری سال بڑی غیر حالت میں گزرا۔ اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ اپنے ہاتھ سے دستخط کر سکے۔ کوئی شخص اس کا ہاتھ پکڑتا تو وہ دستخط کر دیتا۔

جب وہ صدارت سے ریٹائر ہوا تو امریکہ کے ہر گوشے سے ہزاروں لوگ ایس سٹریٹ واشنگٹن میں اس کے گھر یوں آتے جیسے وہ کوئی زیارت گاہ ہو۔ جب وہ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ تو ہزاروں لوگ سر بہ زانو اس کی روح کے لئے دعا گو تھے۔



شعبدہ باز

ہارورڈ تھرسٹن

وہ پادری بننا چاہتا تھا مگر دنیا کا نامور شعبدہ باز بن گیا۔

آج سے کوئی پچاس سال پہلے موسم سرما کی ایک رات کوشکاگو میں تماشائیوں کا ایک بہت بڑا ہجوم میویکرز تھیٹر سے باہر نکل رہا تھا۔ تھیٹر میں ان لوگوں کو اپنے وقت کے سب سے بڑے جادوگر نے بے حد محظوظ کیا تھا۔ اس لئے وہ سب کے سب باہر نکلتے ہوئے ہنس رہے تھے۔

اسی وقت تھیٹر سے باہر فٹ پاتھ پر ایک اخبار فروش لڑکا سردی سے ٹھٹرا ہوا ''روزنامہ شکاگو ٹریبون'' بیچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی حالت قابل رحم تھی۔ اس کے پاس نہ تو تن ڈھانپنے کو کوٹ تھا اور نہ ہی رہنے کے لئے گھر اور نہ رات بسر کرنے کے لئے ہوٹل کا کرایہ۔ اس رات جب تماشائی رخصت ہو گئے تو اپنے اردگرد اخبار لپیٹ کر تھیٹر کے پچھلی طرف ایک بھٹی کے پاس لیٹ گیا۔

اس جگہ لیٹے لیٹے جب وہ سردی اور بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا۔ تو اس نے قسم کھائی کہ وہ بھی جادوگر بنے گا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی لوگوں کو حیرت انگیز کرتب دکھا کر ان سے خراج تحسین وصول کرے۔ فروالا کوٹ پہن کر تھیٹر کی سٹیج پر ادھر ادھر گھومے۔ اور جب سٹیج کے دروازوں پر نظر دوڑائے تو وہاں نوجوان اور خوب صورت لڑکیوں کو اپنا منتظر پائے۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ جادوگر بننے کے بعد وہ اسی

تھیٹر میں اپنے فن کا مظاہرہ کرے گا۔

اس لڑکے کا نام ہارورڈ تھرسٹن تھا۔ بیس سال بعد اس نے اپنی قسم پوری کردی۔ تھیٹر میں اپنے فن کا مظاہرہ کرکے لوگوں سے خراج تحسین وصول کرنے کے بعد وہ تھیٹر کی پچھلی طرف اسی جگہ آیا۔ جہاں پچیس سال پہلے اس نے بھوکے پیاسے رات گزاری تھی۔ اس رات اس نے تھیٹر کی دیوار پر اپنا نام کندہ کیا تھا، جواب بھی موجود ہے۔

13، اپریل 1936ء کو جب ہارورڈ تھرسٹن کا انتقال ہوا تو وہ اپنے آپ کو جادو گروں کا بادشاہ تسلیم کرواچکا تھا۔ گزشتہ چالیس برسوں میں اس نے دنیا کے تمام بڑے بڑے ملکوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرکے تماشائیوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ کم وبیش چھ کروڑ تماشائی اس کے فن کی داد دے چکے تھے۔ اور اس عرصہ میں اس نے جو نفع کمایا تھا وہ 400,000 پاونڈ سے زیادہ تھا۔

ہارورڈ تھرسٹن کی موت سے کچھ عرصہ پہلے میں نے تھیٹر میں اس کے ساتھ ایک شام گزاری۔ میں سٹیج کے بغلی دروازوں سے اس کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ تماشا ختم ہونے کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ ڈریسنگ روم میں لے گیا اور مسلسل کئی گھنٹے اپنے کار ناموں کی کہانیاں سناتا رہا۔ اس کی زندگی کے حقائق بھی ان کرشموں سے کم حیرت انگیز نہ تھے۔ جن کا وہ اسٹیج پر مظاہرہ کرتا تھا۔ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ ایک روز اس کے باپ نے چابک مار مار کر اس کی چمڑی ادھیڑ دی۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے گھوڑوں کو ضرورت سے زیادہ دوڑایا تھا۔ غصے سے پاگل ہوکر ہارورڈ تھرسٹن گھر

سے نکل گیا، اور گلی کوچوں میں دوڑتا ہوا گھر سے غائب ہو گیا۔ پانچ سال تک اس نے ماں باپ کو نہ تو اپنی شکل دکھائی اور نہ ہی اس کے بارے میں کوئی خبر مل سکی۔ مایوس ہو کر وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ ہونہ ہو تھرسٹن مر گیا۔

خود تھرسٹن نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس کا زندہ بچ نکلنا معجزے سے کم نہ تھا۔ در در کی خاک چھاننے کے بعد اس نے بھیک مانگنا شروع کر دی۔ اس طرح بھی پیٹ کی آگ نہ بجھی تو چھوٹی موٹی چوریاں شروع کر دیں۔ وہ سارا سارا دن گلیوں اور سڑکوں پر مارا مارا پھرتا اور رات کو کسی کھنڈر میں یا بند دکان کے تختے پر لیٹ رہتا۔ وہ کئی بار پولیس کے ہتھے چڑھا، کتنی بار لوگوں نے اس کا پیچھا کیا۔ اسے بلاٹکٹ سفر کرنے پر گاڑیوں کے نیچے دھکیلا گیا۔ کئی بار اس پر گولیاں تک چلائی گئیں۔ بعد میں وہ جیبکی اور جواری بن گیا۔ سترہ سال کی عمر میں وہ نیو یارک میں تھا۔ بے یار و مددگار وہ خالی جیب سڑکوں کے چکر کاٹتا، پھر اس کی زندگی کا سب سے زیادہ اہم واقعہ رونما ہوا۔ ایک روز وہ ایک مذہبی جلسہ میں جا گھسا، اور اس نے پادری کو انجیل کے یہ الفاظ دہراتے سنا۔ "تمہارے اندر انسان ہے۔"

پادری کی باتیں سن کر تھرسٹن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے دل کو ٹٹولا اور اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے توبہ کی۔ توبہ کرتے ہوئے وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اس توبہ کے بعد تھرسٹن کے دل کا غبار ہلکا ہو گیا۔ اور وہ ایک انجانی خوشی محسوس کرنے لگا۔ اس نے پادری بننے کے ارادے سے نارتھ فیلڈ کے موڈی بائبل سکول میں داخلہ لے لیا۔ اور اپنی فیسوں وغیرہ کا خرچا پورا کرنے کے

لئے محنت مزدوری کرتا رہا۔

اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ اور اس وقت تک اس نے سکول میں صرف چھ ماہ تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ اس نے تھوڑا بہت پڑھنا بھی بہت عجیب طریقے سے سیکھا تھا۔ مال گاڑی میں بیٹھ کر وہ ریل لائن کے دونوں جانب لگے ہوئے اشتہاروں کو دیکھتا اور پھر ان میں سے کسی نہ کسی لفظ کے ہجے اپنے ساتھی سے پوچھ کر زبانی یاد کر لیتا۔ وہ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ بائبل سکول میں داخلہ لینے کے بعد وہ دن کے وقت یونانی زبان اور بیالوجی سیکھتا اور رات کو لکھنے پڑھنے اور ریاضی کا سبق لیتا۔

بالآخر اس نے پادری ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس ارادے سے پینسلوینا یونیورسٹی میں داخلہ لینے ہی والا تھا کہ ایک ایسا چھوٹا واقعہ ہوا کہ جس نے اس کی زندگی کا رخ پھیر دیا۔

عیسی چوسٹس سے فلاڈیلفیا جاتے ہوئے اسے البانی کے مقام پر گاڑی بدلنا تھی۔ گاڑی کے آنے تک اپنا فارغ وقت گزارنے کے لئے وہ ایک تھیٹر میں چلا گیا۔ یہاں الیگزینڈر ہرمن جادو کے کرتب سے حاضرین کو مسحور کر رہا تھا۔ تھرسٹن کو بچپن ہی سے ایسے کرتبوں سے بڑی دل چسپی تھی۔ وہ اپنے دوستوں کو اکثر تاش کے کرتب دکھایا کرتا تھا۔ اس شوق کی وجہ سے وہ الیگزینڈر ہرمن کا بہت بڑا عقیدت مند تھا۔ تھیٹر میں جب اس نے الیگزینڈر ہرمن کو اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا تو اس کا جی چاہا کہ وہ اس سے بات کرے۔ اور جب کچھ اور نہ بن پڑا تو اس نے اس

ہوٹل میں جہاں الیگزینڈر ہرمن ٹھہرا ہوا تھا، اس کے ساتھ والا کمرہ کرائے پر لے لیا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ ہرمن کے کمرے میں جا کر اس سے بات کرے۔ لیکن ہر بار ہرمن کے دروازے پر پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے جاتی۔

دوسری صبح وہ اس مشہور جادوگر کا پیچھا کرتا ہوا ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا اور پلیٹ فارم پر اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہو کر چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ جادوگر سایرا کوز جا رہا تھا۔ اور تھرسٹن کو نیویارک جانا تھا۔ کم از کم وہ دل میں یہی سوچ رہا تھا کہ اسے نیویارک جانا ہے۔ وہ نیویارک کی ٹکٹ خریدنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن غلطی سے اس نے بھی اسی شہر کی ٹکٹ خرید لی جہاں اس کا محبوب جادوگر جا رہا تھا۔

اس غلطی نے اس کی کایا پلٹ دی۔ اور اس غلطی سے وہ پادری کی بجائے جادوگر بن گیا۔

جن دنوں تھرسٹن کی شہرت عروج پر تھی۔ وہ ایک تماشے کے لئے دو سو پونڈ لیتا تھا۔ لیکن میں نے اسے کئی بار یہ کہتے سنا تھا کہ اس کی زندگی کا سب سے اچھا دور وہ تھا۔ جب وہ طبی امداد کے شو کے لئے صرف پانچ شلنگ کے عوض تاش کے کرتب دکھایا کرتا تھا۔ اب اشتہاروں اور خبروں میں اس کا نام جلی حروف سے لکھا جاتا تھا۔ اور وہ ”تھرسٹن شمال کا عظیم جادوگر کہلاتا تھا۔“

تھرسٹن نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بہت سے لوگ اس جتنے کرتب جانتے ہیں۔ پھر آخر اس کی کامیابی کا راز کیا تھا؟۔

اس کی کامیابی کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنی شخصیت کو پوری طرح اجاگر

کرنا جانتا تھا۔ وہ ایک عظیم فن کار تھا۔ وہ انسانی فطرت سے پوری طرح واقف تھا۔
وہ کہا کرتا تھا کہ جادوگر کے لئے لوگوں کی نفسیات کو سمجھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا
کہ جادو کا جاننا۔ کرتب تو خیر بڑی بات ہے۔ وہ سٹیج پر کوئی حرکت کرنے سے پہلے
خواہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو اس کی خوب ریہرسل کر لیتا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے تماشائیوں سے محبت کرتا تھا۔ پردے اٹھنے سے پہلے
وہ اپنے آپ کو چست بنانے کے لئے سٹیج پر ادھر ادھر گھومتا رہتا۔ اور اپنے آپ بڑ
بڑاتا کہ مجھے اپنے تماشائیوں سے محبت ہے۔۔۔ انہیں محظوظ کرنے میں مجھے بہت
لطف آتا ہے۔۔۔ میرا فن بہت عظیم ہے۔۔ میں کس قدر خوش ہوں۔ میں کس
قدر خوش ہوں۔''

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ خود خوش نہ ہوا تو کسی اور کو خوش نہ کر سکے گا۔



کلاڈ ولیم ڈوکن فیلڈرز

وہ دھوبی کی دھلی ہوئی چادروں پر سونا زندگی کا سب سے بڑا تعیش خیال کرتا تھا

ہالی وڈ کے فلمی اداکاروں میں ایک ایسا بھی تھا۔ جس کا بڑا اور بے ہنگم سا سرخ ناک اس کے چہرے پر بے حد مصنوعی معلوم ہوتا تھا۔ اس بھاری بھرکم شخص کا نام کلاڈ ولیم ڈوکن فیلڈرز تھا۔ ایک کامیاب اور عظیم ایکٹر بننے سے پہلے وہ فلم ڈائریکٹروں کے پیچھے پیچھے مارا مارا پھرتا تھا۔ وہ کئی کئی گھنٹے ڈائریکٹروں کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ وہ گزشتہ بیس برسوں سے فلموں میں کام کر رہا تھا۔ لیکن اس سارے عرصہ میں اس کی حالت اس قدر پتلی رہی کہ وہ صرف اس بات پر کسی فلم کی کہانی لکھنے اور اس میں کام کرنے اور اسے ڈائریکٹ کرنے کے لئے تیار تھا کہ اسے کسی قسم کے معاوضے کی بجائے فقط ایک فلم بنانے کا موقع دیا جائے۔ وہ اپنی یہ خواہش لئے فلم سازوں کے دروازے کھٹکھٹاتا رہا۔ لیکن ہر جگہ سے اسے نفی میں جواب ملا۔

لیکن جب ''ڈیوڈ کاپر فیلڈ'' نامی فلم مکمل ہوئی تو اسے دس دن کے کام کا معاوضہ دس ہزار پونڈ ملا۔ ایک دن کے ایک ہزار پونڈ۔ یعنی ایک منٹ کا معاوضہ دو پونڈ۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ اسے ہالی وڈ میں ایک دن کی اداکاری کا معاوضہ امریکہ کے صدر کی ایک دن کی تنخواہ سے پچیس گنا زیادہ ملتا تھا۔ ''ڈیوڈ کاپر فیلڈ'' فلم میں اس

نے مسٹر مکابر کا کردار انجام دیا تھا۔ ہالی وڈ میں اس کے سوا اور کوئی اداکار یہ کام انجام نہیں دے سکتا تھا۔

اپنے نام کو پردہ سکرین پر دیکھنا دنیا کے اس عظیم شعبدہ باز کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ لیکن دوسری طرف گندے اور تنگ و تاریک کمروں میں زندگی گزارنا بھی اس کے لئے کوئی بات نہ تھی۔ اس کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ پورے چار برس تک بستر پر نہ سویا۔ وہ عوامی پارکوں میں بنچوں پر اکثر اوقات زمین میں بڑے بڑے سوراخوں میں سوتا اور سردی سے بچنے کے لئے پتوں کا ڈھیر اپنے اوپر بچھا لیتا تھا۔ دھوبی کی دھلی ہوئی چادروں پر سونا اس کے لئے زندگی کا سب سے بڑا تعیش تھا۔ اور یہ تعیش وہ ایک دن حاصل کر کے رہا۔

جہاں تک شعبدہ بازی کا تعلق ہے۔ دنیا میں ڈبلیو۔ سی۔ فیلڈز کے مقابلے کا کوئی شعبدہ باز نہیں۔ وہ چودہ برس کی عمر میں اس فن کی مشق کرنے لگا تھا۔ وہ تقریباً ہر روز مشق کرتا، اور دن میں سولہ سولہ گھنٹے۔ حتیٰ کہ بیماری کے عالم میں بھی جب اس میں کھڑا ہونے کی سکت نہ ہوتی تو وہ پھر بھی مشق کرتا رہتا۔

شعبدہ بازی کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ ایک شعبدہ باز کو ہر اس چیز کا شعبدہ دکھانا چاہیئے۔ جسے وہ اٹھا سکتا ہو۔ وہ انڈوں، تھالیوں، جوتوں، اینٹوں اور سگرٹوں اور دوسری اس قسم کی اشیاء سے حیرت ناک کرتب اور کھیل دکھاتا۔

اس نے دنیا کے تقریباً ہر ملک میں اپنے شعبدے دکھائے۔ جنگ بوئر کے دوران میں وہ جنوبی افریقہ گیا۔ اور وہاں عوام کو اپنے کھیلوں سے حیران کرتا رہا۔

ہندوستان، مصر، فرانس، آسٹریلیا، برطانیہ اور جرمنی کے عوام بھی اس کے شعبدہ بازی کے کمال دیکھ چکے تھے۔

بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ فیلڈ انگلینڈ کا رہنے والا تھا۔ لیکن یہ غلط ہے وہ پنسلوینیا میں پیدا ہوا۔ مگر اس نے اپنا زیادہ وقت فلاڈلفیا میں گزارا۔

ڈبلیو۔ سی۔ فیلڈ نے اس وقت سے دنیا کے گرد چکر کاٹنا شروع کیا۔ جب وہ گیارہ برس کا تھا۔ اپنے والد سے ایک غلط فہمی کی بنا پر وہ گھر سے بھاگ گیا۔ یہ واقعہ سناتے وقت اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آجاتی تھی۔ ان کے مکان کے صحن میں ایک کدال پڑی تھی۔ بس اسی کدال پر باپ بیٹے کا جھگڑا ہو گیا۔ اچانک ایک دن اس کے والد کا پاؤں کدال پر پڑ گیا۔ وہ اس طرح اچھلی کہ اس کا ٹخنہ زخمی کر گئی۔ اس بات پر اسے غصہ آگیا۔ یہ کدال ڈوکن فیلڈز نے وہاں رکھی تھی۔ باپ نے غصے میں آکر وہی کدال پکڑ کر اس کا دستہ بیٹے کے شانے پر دے مارا۔

اس چوٹ نے ننھے ڈوکن فیلڈز کی زندگی کا نقشہ بدل دیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی ہتک کی گئی ہے۔ وہ چپکے سے اندر گیا، اور ایک بڑا سا صندوق پکڑ کر کرسی پر کھڑا ہو گیا۔ جب اس کا باپ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے صندوق اس کے سر پر دے مارا۔ اس کے بعد وہ گھر سے یوں بھاگا کہ واپس نہ آیا۔ دوسری دفعہ جب باپ اور بیٹے میں ملاقات ہوئی تو ننھا کلاڈ ڈوکن فلیڈز، ڈبلیو۔ سی فیلڈز بن چکا تھا۔ دنیا کا عظیم شعبدہ باز۔

گھر چھوڑنے سے سولہ برس کی عمر تک وہ ایک آوارہ کتے کی طرح وہ بے گھر

پھرتا رہا۔

اسے سونے کے لئے جہاں کوئی کونہ کھدرا مل جاتا ہو، وہیں سو رہتا۔ کھانے کے لئے جو ملتا، کھا لیتا۔ اس نے صبح کے وقت امیر گھروں کے سامنے سے دودھ کی اس قدر بوتلیں اٹھائیں کہ بعد میں نگران کتوں کو دیکھ کر اسے کپکپی چھڑ جاتی۔ اس سے باتیں کرتے وقت آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے ڈکنز کے ناول سے کوئی کردار زندہ ہو گیا ہے۔

ایک زمانے میں اس نے سمندر میں ڈوبنا اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ وہ پانی میں اتر جاتا، اور پھر ڈوب گیا، ڈوب گیا کا شور مچا کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتا۔ اسے بچانے کا منظر دیکھنے کے لئے لوگوں کا ایک ہجوم کھڑا ہو جاتا۔ اتنے میں چھابڑی والے اشیائے خوردنی لے کر وہاں پہنچ جاتے، اور لوگ وقت گزارنے کے لئے ان سے چیزیں خرید لیتے۔ بعد میں وہ چھابڑی والوں سے اپنا کمیشن لے لیتا۔ بعض اوقات وہ دن میں چار پانچ مرتبہ ڈوبتا۔

سپاہیوں نے اسے اتنی دفعہ پکڑ کر قید کیا تھا۔ کہ اسے اعداد و شمار بھی یاد نہ رہے تھے۔ ایک زمانے میں وہ برف کے ایک کارخانے میں کام کیا کرتا تھا۔ مگر وہاں بھی وہ برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے شعبدہ بازی کی مشق کیا کرتا تھا۔ دو برس کی مشق کے بعد اسے پتا چلا کہ ایک تھیٹر میں ایک شعبدہ باز کی ضرورت ہے۔ وہ ایک پونڈ ہفتہ پر وہاں ملازم ہو گیا۔ لیکن تھیٹر کا لالچی مینجر اس میں سے بھی چھ شلنگ اپنا کمیشن رکھ لیتا تھا۔ لہذا پیسہ بچانے کے لئے وہ گھٹیا کھانا کھاتا اور تھیٹر کے ڈریسنگ

روم میں سو جاتا تھا۔

پھر تین ماہ تک اسے وہاں کوئی کام نہ ملا۔ تھیٹر کی خستہ حالی سے تنگ آ کر اس نے وہاں کام کرنا چھوڑ دیا۔ اس کے علاوہ تھیٹر کے منیجر نے اسکی بہت سی رقم مار لی تھی۔ لیکن زندگی مسلسل سختیوں میں گزارنے کے بعد اب اسے اس قسم کی تکلیفوں کا بالکل احساس نہ رہا تھا۔

ڈبلیو، سی فیلڈز نے ہالی وڈ میں اپنا ایک شاندار سا مکان بنوایا تھا۔ اس کے پرائیویٹ ڈریسنگ روم میں پچاس ہیٹ چھت سے لٹکتے رہتے تھے۔ اس کے شعبدے دیکھنے کے لئے لوگ تھیٹر میں بڑی بے قراری سے اس کا انتظار کرتے۔ وہ شعبدے جن میں ماہر ہونے کے لئے اس نے چالیس برس صرف کیے تھے۔ لیکن اب اتنا ضرور ہوا کہ وہ ہر رات دھوبی کی دھلی ہوئی چادروں پر سوتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ "بستر پر دراز ہوتے وقت وہ صبح اٹھتے وقت صاف ستھری چادریں دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔"



کنجوس لوگ

جان گٹ لب وینڈل

وہ زمین کے جراثیم سے بچنے کے لئے ایک انچ موٹے تلے والا جوتا پہنتا

نیویارک کا وہ مکان جس کے بارے میں بہت چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔گلی نمبر 39 کے پانچویں موڑ پر تھا۔بیس سال تک یہ گھر پراسرار مکان کے نام سے مشہور تھا۔اس کی اداس دیواروں کے ارد گرد جاسوسی کہانیاں،اخباری مضامین،ڈراموں حتیٰ کہ متحرک فلموں کے تانے بانے پھیلے رہتے تھے۔اس مکان کے صدر دروازے پر گھوڑے کا نعل آویزاں تھا۔ہر سال روزانہ کم و بیش پچاس ہزار لوگ اس دروازے کے سامنے سے گزرتے تھے۔لیکن ان میں سے کسی نے آج تک اس مکان کی کھڑکیوں کے اندر زندگی کا نشان نہ دیکھا تھا۔

اگر آپ کو کبھی تفریحی بس میں بیٹھ کر ففتھ ایونیو جانے کا موقع ملا ہو تو غالباً وینڈل ہاؤس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کا ان الفاظ میں تعارف کرایا گیا ہوگا۔یہ دنیا کا واحد گھر ہے۔جہاں کتے کے کھیلنے کے لئے 200,000 پونڈ کے خرچ سے طویلہ بنایا گیا تھا۔

وینڈل خاندان نیویارک کے امیر ترین گھرانوں میں سے تھا۔ان کی جاگیر کی مالیت کا اصل اندازہ 20,000,000 پونڈ کے لگ بھگ تھا۔لیکن اس کے باوجود وہ

بہت قدامت پسند تھے۔ایک غیر شادی شدہ بھائی اپنی بہنوں کے ساتھ ایسے مکان میں رہتا تھا۔جس کی بنیاد اس وقت ڈالی گئی تھی۔جب ابرہیم لنکن ابھی الینس میں ایک گمنام وکیل کی حیثیت سے زندگی کے دن گزار رہا تھا۔میں اب بھی تصورات کی دنیا میں گم ہو کر اس مکان کی تعمیر کا نظارہ کرتا ہوں۔اور مجھے وہ مزدور سنگ مرمر اور دھات کے وہ ٹکڑے لے جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔جو دور غلامی میں تعمیرات کے کام آتے تھے۔

وینڈل لوگ روشنی کے لئے گیس کی بتیاں استعمال کرتے تھے۔کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بجلی کی نسبت یہ آنکھوں کے لئے کم نقصان دہ ہے۔انہیں وائرلیس سیٹ، ملازموں، لفٹ اور موٹر کاروں سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔موجودہ آسائشوں سے گھر میں صرف ایک ٹیلی فون تھا۔اور وہ بھی وینڈل کنبے کے آخری فرد کی موت سے دو روز پہلے لگایا گیا تھا۔تاکہ نرس ضرورت پڑنے پر ڈاکٹر کو بلا سکے۔

وینڈل ہاؤس کی مالیت کا جو اندازہ لگایا گیا تھا۔وہ صرف 1500 پونڈ تھا۔لیکن ذاتی وکیل کنبے والوں کو اکثر کہا کرتا تھا کہ 1500 پونڈ مالیت کے اس گھر میں رہنے کے لئے انہیں روزانہ 200 پونڈ خرچ کرنا پڑتا تھا۔اور یہ بات سچ بھی تھی۔کیونکہ جس زمین پر یہ مکان کھڑا تھا۔اس کی قیمت 800,000 پونڈ کے لگ بھگ تھی۔اور اس رقم کا سود اور ٹیکسوں وغیرہ کو ملا کر روزانہ کوئی چار سو پونڈ خرچ کا اندازہ بیٹھتا تھا۔

لیکن اس ساری دولت کے باوجود وینڈل کنبے کا رہن سہن بالکل قدامت پسندانہ تھا۔اپنی موت تک اس کے کپڑوں کی کٹائی اور سلائی بالکل اس سوٹ کے

مطابق تھی جو اس نے خانہ جنگی (1865ء) کے آخری دور میں بنوایا تھا۔ یہ سوٹ اس صندوق میں پڑا تھا۔ جہاں اسے کوئی چالیس برس پہلے پہلی بار رکھا تھا۔ اور جان نے اسی سوٹ کی طرح کوئی اٹھارہ سوٹ بنوا رکھے تھے۔ وہ کوئی رنگین کپڑا نہ پہنتا تھا۔ اس لئے اگر اسے سیاہ سوٹ کی ضرورت پڑتی تو وہ سکاٹ لینڈ کی ایک فرم سے کپڑا منگواتا تھا، جو اس کے لئے خاص طور پر سیاہ بھیڑوں کی اون سے تیار کرتی تھی۔

بارش ہو یا دھوپ، گرمی ہو یا سردی، جب بھی وہ باہر نکلتا، اس کے ہاتھ میں چھتری ضرور ہوتی تھی۔

اس کے پاس تنکوں کا بنا ہوا ایک ہیٹ تھا۔ جو اس نے کئی سال مسلسل استعمال کیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بالکل بوسیدہ ہو گیا۔ اس کے باوجود وہ اس پر ہر سال رنگ کروالیتا۔ اس طرح ہیٹ دوبارہ استعمال کے قابل ہو جاتا۔ وہ جب بھی اپنے دوستوں کو دعوت پر بلاتا تو دعوت نامے لاطینی زبان میں چھپواتا۔

اس کا ایمان تھا کہ تمام عجیب وغریب بیماریوں کے جراثیم پاؤں کے ذریعے انسانی جسم تک پہنچتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے پیروں کو جراثیم سے محفوظ رکھنے کے لئے گئے پارچے کے بنے ہوئے جوتے پہنتا تھا۔ جن کا سول ایک انچ موٹا ہوتا تھا۔

جان گٹ لب وینڈل اپنے وقت میں نیو یارک کا سب سے بڑا جاگیردار تھا۔ اور اس کے امیر بننے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی جگہ جما بیٹھا تھا۔ اور اس کے ارد گرد شہر آباد ہو گیا تھا۔

وینڈل کی بہنیں شراب نوشی کے سخت خلاف تھیں۔ ایک بار انہوں نے

200,000 پونڈ کے چیک پر محض اس لئے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ اس بات کی ضمانت چاہتی تھیں کہ اس عمارت میں ابتدائی طبی امداد کا جو سامان اور دواؤں کی جو الماری رکھی جائے گی۔ اس میں ایک گلاس سے زیادہ الکحل شامل نہیں ہوگی۔ اس کے باوجود ان کے گھر سے ان کی موت کے بعد 2000 پونڈ مالیت کی نایاب شرابیں، وسکی اور شمپین برامد ہوئی۔ انھیں کبھی چھوا تک نہیں گیا تھا۔ اور یہ سب کی سب اپنی جگہ پر پڑی سڑ گئی تھیں۔ جان گوٹ لب وینڈل کی سات بہنیں تھیں۔ اور اس نے ان سب کو شادی سے باز رکھنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر انہوں نے شادیاں کرلیں اور ان کے بچے ہو گئے۔ تو تمام جاگیر کے حصے بخرے ہو جائیں گے۔ اس لئے اس نے انہیں متنبہ کر دیا کہ تمام مرد ان کی دولت کے بھوکے ہیں اور اگر ان سے ملنے کوئی مرد آتا تو وہ اسے صاف طور پر کہہ دیتا کہ وہ دوبارہ ادھر آنے کی جرات نہ کرے۔

ان میں سے صرف ایک بہن مس ریکا نے شادی کی اور وہ بھی ساٹھ برس کی عمر میں۔ باقی بہنیں کسی سے رشتہ جوڑے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ ان کی کھوکھلی زندگی کی داستان اس حقیقت کی درخشندہ مثال ہے۔ کہ پیسہ بذات خود کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

تمام بہنوں میں جار جینا سب سے زیادہ دلیر تھی۔ وہ خاندانی پابندیوں کے خلاف مسلسل جہاد کرتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ ذہنی مرض کا شکار ہو گئی۔ پورے بیس برس وہ دماغی امراض کے شفاخانے میں زیر علاج رہی۔ اور جب 1930ء میں

اس کا انتقال ہوا۔ تو اس کے بہت سے دوست یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ وہ کئی برس پہلے مر چکی ہے۔ وہ تنہا تقریباً 1,000,000 پونڈ کی مالک تھی۔ لیکن اتنی دولت سے اسے رتی بھر خوشی نصیب نہ ہو سکی۔ ایک اور بہن جوزافین اپنی ایک دیہاتی حویلی میں رہتی تھی۔ جہاں نوکروں کے سوا اور کوئی نہ ہوتا تھا۔ اس کی زندگی کا سب سے الم ناک پہلو یہ تھا کہ وہ اسی تصور میں کھوئی رہتی تھی۔ کہ اس کا گھر خوش وخرم اور بچوں سے آباد ہے۔ اور وہ ان کے ساتھ باتیں کر اور کھیل رہی ہے۔ وہ یہ بھی تصور کرتی کہ لوگ اس سے ملنے آ رہے ہیں۔ چنانچہ بار بار نوکروں کو حکم دے کر خیالی مہمانوں کے لئے کھانے کی میزیں لگواتی۔ خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ جاتی، وہاں بیٹھ کر تھوڑا سا کھانا کھاتی، پھر دوسری کرسی پر چلی جاتی، پھر تیسری اور پھر چوتھی کرسی پر اور اس طرح خود کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتی کہ بہت سے مہمان کھانا کھا رہے ہیں۔

یکے بعد دیگرے جب بہنوں کا انتقال ہو گیا تو ان کے دروازوں پر تالے پڑتے گئے۔ اور ان کی کھڑکیاں بند ہوتی گئیں۔ حتیٰ کہ آخر میں مس الاصرف اپنے سونے کا کمرہ نچلی منزل میں کھانے کا کمرہ اور اوپر والی منزل میں وہ بڑا سا چوبارہ کھلا رکھتی تھی۔ جہاں اس نے اپنی دوسری بہنوں کے ساتھ زندگی کے دن گزارے تھے۔ کئی برس تک وہ اس چالیس کمروں والے مکان میں اپنے فرمانبردار نوکروں اور اپنے فرانسیسی کتے ٹوبی کے ساتھ رہی۔ ٹوبی الا کے کمرے میں ہی سوتا تھا۔ اور اس کا بستر بھی اپنی مالکن کے بستر جیسا تھا۔ کھانے کی میز پر ٹوبی علیحدہ میز کرسی پر بیٹھ کر بسکٹ اور مربہ کھایا کرتا تھا۔

ایلا وینڈل مرتے وقت اپنی تمام جاگیر تبلیغی کاموں کے لئے میتھوڈسٹ گرجے کے نام وقف کر گئی۔ حالانکہ اپنی زندگی میں اس نے کبھی کبھار گرجے کا رخ کیا تھا۔

مرتے وقت اسے یقین تھا کہ دنیا میں اس کا کوئی عزیز رشتے دار زندہ نہیں۔

لیکن صرف ایک سال کے عرصے میں اس کے کوئی 2300 نام نہاد رشتے دار حشرات الارض کی طرح نکل آئے۔ صرف ڈنسی میں 290 رشتے دار پیدا ہو گئے۔ اور سب کے سب 7000.000 پونڈ جاگیر کے لئے منہ کھولے بیٹھے تھے۔ جرمنی سفارت خانے نے 400 وینڈلوں کی طرف سے دعویٰ دائر کیا اور چیکوسلواکیہ میں اتنے وارث پیدا ہو گئے کہ وزارت خارجہ کی مدد لینا پڑی۔

دو اشخاص نے دعویٰ کیا کہ وہ جان وینڈل کی دو خفیہ شادیوں سے پیدا ہوئے تھے۔ اور ان میں سے ایک کو تو بعد میں شادی کا جعلی سرٹیفکیٹ اور نقلی وصیت نامہ تیار کرنے پر سزائے قید بھی بھگتنا پڑی۔

جان گوٹ لب وینڈل نے کوئی وصیت نہ کی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ وہ اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ کوئی وکیل اس کی جائیداد سے روپیہ کمائے اور ہاں مزے کی بات یہ ہے کہ جاگیر کے فیصلے سے پہلے ایک وکیل نے نہیں بلکہ 250 وکیلوں نے وینڈل کے وارثوں سے فیسیں وصول کی تھیں۔



ہیٹی گرین

وہ دو کروڑ پونڈ کی ملک تھی، لیکن صبح اخبار خرید کر اسے دوبارہ نصف قیمت پر فروخت کر دیتی۔

ایک وقت میں ہیٹی گرین دنیا کی امیر ترین عورت تھی۔ مرتے وقت اس کے پاس 20,000,000 پونڈ تھے۔ اس کے باوجود ہر متوسط عورت اس سے اچھا لباس پہنتی، اچھا کھانا کھاتی اور اس سے اچھے کمرے میں سوتی۔

اس کی آمدنی ایک پونڈ فی منٹ تھی۔ پھر بھی وہ صبح کا اخبار ایک پینی میں خرید کر اسے دوبارہ فروخت کر دیتی۔

سخت سردی میں وہ خود کو گرم رکھنے کے لئے اپنے لباس کے اندر اخبار تہہ کر کے رکھ لیتی۔ امریکہ میں وہ ریلوے کمپنیوں کی مالک تھی۔ اور دوسری کمپنیوں میں اس کے حصے تھے۔ اس کے باوجود اگر اسے کبھی رات کے وقت سفر کرنا ہوتا تو وہ ان ڈبوں میں ہرگز سفر نہ کرتی۔ جن میں رات کے وقت سونے کا انتظام ہوتا ہے۔ بلکہ عام ڈبوں میں سفر کرتی۔

ایک دفعہ اس نے اپنے احباب کو بوسٹن میں پارک ہاؤس میں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ ہر کوئی سمجھتا تھا کہ بڑا ہنگامہ پرور موقع ہو گا۔ خواتین اپنے بہترین لباس اور مرد ڈنر سوٹ پہن کر آئے۔ لیکن جب تمام مہمان آ چکے تو ہیٹی انہیں وہاں سے

لے کر پیدل چل پڑی اور تین چار فرلانگ دور ایک سستے ہوٹل میں کھانا کھلایا۔

بعض اوقات جب وہ بوسٹن میں ہوتی تو کسی نہایت گھٹیا اور سستے ہوٹل میں کھانا کھاتی۔ اپنی غذا پر اس نے کبھی تین پنس سے زیادہ خرچ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس کی آمدنی اس زمانے میں تین پنس فی سیکنڈ تھی۔

جب وہ اٹھہتر برس کی ہوئی تو ایک اخباری نمائندے نے اس سے اس کی اچھی صحت کا راز پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ صبح کے وقت تھوڑی سی ترکاری، بھنے ہوئے آلو، چائے کی پیالی اور تھوڑا سا دودھ پیتی ہے۔ اور پھر ان کے جراثیم ہلاک کرنے کے لئے پیاز کھاتی ہے۔ لیکن اس نے یہ نہ بتایا کہ وہ پیاز کے جراثیم ہلاک کرنے کے لئے وہ کیا کرتی ہے۔؟۔

1893ء کے گرم دنوں میں ہٹی گرین ورثے میں ملے ہوئے اپنے گودام میں جاتی، اور پسینے میں شرابور وہاں بیٹھ کر کام کرنے لگتی۔ کس قسم کا کام؟۔ وہ سفید چیتھڑوں کو رنگ دار چیتھڑوں سے الگ کرتی۔ کیونکہ انہیں خریدنے والے سفید چیتھڑوں پر نصف پنس زیادہ دیتے تھے۔

اسے اپنا زیادہ تر وقت وال سٹریٹ میں اپنے سرمائے کی دیکھ بھال پر صرف کرنا پڑتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ نیویارک میں اپنا مکان لے کر رہنے لگی۔ تو انکم ٹیکس والے اس کے پیچھے سائے کی طرح گھومنے لگیں گے۔ اور اسے ہر سال چھ ہزار پونڈ بطور انکم ٹیکس ادا کرنا ہوں گے۔ لہذا اس نے انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے ایک ترکیب نکالی۔ وہ کسی سستے ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیتی، اور پانچ چھ روز بعد کسی

دوسرے ہوٹل میں منتقل ہو جاتی۔ بعض اوقات اس کے بہترین احباب کو بھی اس کی جائے رہائش کا علم نہ ہوتا۔ بعض اوقات وہ کسی فرضی نام سے ہوٹل میں رہتی۔ اور اتنا خراب لباس پہنتی کہ ہوٹل والوں کو کسی خستہ حال خاتون کا دھوکہ ہونے لگتا۔ اور وہ اس سے پیشگی کھانے کے دام اور کمرے کا کرایہ رکھوا لیتے۔

جب وہ بوڑھی ہونے لگی تو ایک معجزہ رونما ہوا۔ اس کے ایک دوست نے اسے بتایا کہ وہ ساٹھ پونڈ خرچ کر کے ایک نسخہ خرید سکتی ہے۔ جس سے وہ قدرے جوان دکھائی دے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نے ساٹھ پونڈ خرچ کر دیئے۔

اس خیال کے ڈر سے کہ کہیں کوئی اس کے دستخطوں کی نقل اتار کر اسے فریب دینے کی کوشش نہ کرے۔ وہ ہمیشہ دستخط کرنے سے گھبراتی تھی۔ فقط ناگزیر حالات میں دستخط کرتی۔ لوگوں کی طرف سے اس کے پاس جتنے خطوط آتے، وہ کاغذ بچانے کی خاطر انہی کی پشت پر جواب لکھ کر بھیج دیتی۔

میرے ایک دوست بوائڈن سپارکس نے ہیٹی گرین کی سوانح حیات لکھی ہے۔ اس کتاب کا نام ”ہیٹی گرین دولت سے محبت کرنے والی خاتون ہے۔“ اس نے مجھے بتایا کہ نیویارک کے کیمیکل نیشنل بنک میں ہیٹی گرین کا بہت سا روپیہ جمع تھا۔ اس نے اپنا گھر بھی اس بنک میں بنا لیا۔ اور اپنے ترنک اور سوٹ کیس بنک میں رکھ دیے تھے۔ وہ اپنا پرانا لباس بینک کے سیف میں رکھتی تھی۔ وہ کہیں سے ایک گھوڑا گاڑی خرید لائی تھی۔ اور اس کے پہیے اتار کر بنک کی دوسری منزل پر رکھ دیئے، اور اس میں رہنے لگی۔ جب اس نے وہ کمرہ فروخت کیا تو اپنا فرنیچر بھی بنک

میں رکھ دیا۔

ان سب باتوں کے باوجود وہ ایک شفیق خاتون تھی ۔ بنک میں ایک بوڑھا چپراسی تھا، جو بنک کے شیشے صاف کرنے کے علاوہ بعض ضروری کام بھی کرتا تھا۔ بنک والوں نے اسے نکال دیا۔ ہیٹی گرین کو اس بات کا دکھ ہوا۔ اور اس نے اتنی دیر تک آرام نہ کیا، جب تک اسے دوسری جگہ ملازم نہ رکھوا دیا۔

وہ 81 برس کی عمر میں فالج کے ایک حملے سے وفات پا گئی ۔ اس کی بیماری کے دوران اس کی دیکھ بھال کرنے والی نرسوں کو سفید اور صاف ستھرا لباس پہننے کی اجازت نہ تھی ۔ وہ عام لباس پہنتیں ۔ تا کہ ہیٹی گرین انہیں عام ملازمائیں سمجھے۔ اگر بوڑھی عورت کو یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ تربیت یافتہ نرسیں تھیں ۔ اور ان کے اخراجات بھی اسے ہی برداشت کرنے پڑ رہے تھے ۔ تو بے چاری آرام سے نہ مر سکتی تھی۔



اہل دل

میو برادران

ایک گمنام قصبے کے دولڑکے جو دنیا کے عظیم ترین سرجن بن گئے۔

آج سے کوئی پچاس برس پہلے منی سوٹا کا ایک شہر زبردست طوفان کی زد میں نہ آتا تو شاید طب کی تاریخ میں ایک حیرت انگیز دریافت نہ ہوتی۔

طوفان کی زد میں آنے والے شہر کا نام روچسٹر تھا۔جسے آج دنیا دو مشہور سرجنوں میو برادران کے وطن کے نام سے جانتی ہے۔وہ حیرت انگیز دریافت جس پر ڈاکٹر سی،ایچ میو آج بھی کام کر رہے ہیں،پاگل پن کے علاج کی دوا ہے۔یہ دوا انجکشن کی شکل میں کمزور ذہن یا پاگل شخص کے جسم میں داخل کرنے سے اس کے خون کی گردش ٹھیک ہو جاتی ہے۔اور مریض تندرست ہو جاتا ہے۔اس دریافت سے بنی نوع انسان کو کتنا فائدہ پہنچے گا؟۔اس کا اندازہ آپ مندرجہ ذیل حقائق سے لگا سکتے ہیں۔

امریکی ہسپتال میں دوسری تمام بیماریوں کے مقابلے میں ذہنی امراض کے مریض سب سے زیادہ ہیں۔آج جو طلباء مدرسوں میں زیر تعلیم ہیں۔ان میں سے ہر سولہ طلباء میں سے ایک کو اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں ذہنی امراض کے شفا خانے میں داخل ہونا پڑے گا۔

اس بات کے بہت زیادہ امکانات ہیں کہ آپ کو ذہنی امراض میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی کے سات سال ایسے شفا خانے میں بسر کرنا پڑیں۔گزشتہ برسوں میں ذہنی

امراض میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد دوگنی ہوگئی ہے۔اگر اگلی صدی میں بھی یہ امراض اسی تیزی سے بڑھتے رہے تو آدھی آبادی پاگل خانوں میں زیر علاج ہوگی۔ اور باقی آدھے لوگ پاگل خانوں سے باہر ان کے علاج معالجے کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے ٹیکسوں کا بوجھ اٹھا رہے ہوں گے۔وہ دونوں بھائی ایک مقامی کیمسٹ کی دکان پر کام کرتے تھے۔اور نسخے تیار کرنے اور دوا کی پڑیاں باندھنے کی تربیت لیتے تھے۔یہیں سے وہ میڈیکل کالج میں داخل ہوگئے۔

پھر ایک المناک حادثہ ہوا۔ایسا حادثہ جس نے علم ادویات کی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا۔

حادثہ یہ تھا کہ اس علاقے میں زبردست طوفان آیا۔اتنا شدید کہ جس سے جانی اور مالی نقصان ہوا۔خاص طور پر روچسٹر کی تو اینٹ سے اینٹ بج گئی۔اس جگہ ہزاروں لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔کئی روز تک میو برادران اپنے والد کے ساتھ ملبوں سے نعشیں نکالتے رہے۔اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے رہے۔

سینٹ فرانسس کے نرسوں کے ادارے کی سربراہ سسٹر ایلفریڈ ان کے اس جذبے سے بے حد متاثر ہوئی،اور اس نے پیش کش کی کہ اگر میو برادران انتظام سنبھالنے پر راضی ہوں تو انہیں ملازمت مل سکتی ہے۔وہ رضامند ہوگئے اور جب 1889ء میں میو کلینک کھولا گیا تو اس وقت بڑے ڈاکٹر میو کی عمر 77 برس تھی۔ اور اس کے دونوں بیٹے عین اپنے والد کا مخالف رخ تھے۔میو برادران جو اس حیرت انگیز دوا کی تیاری میں مصروف ہیں۔دنیا کے کامیاب ترین سرجنوں میں سے ہیں۔

لندن، پیرس، روم، کیپ ٹاؤن اور ٹوکیو سے ڈاکٹر رچسٹر پہنچتے ہیں۔ اور ان کے زیر سایہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہر سال ساٹھ ہزار مریض، جن میں سے اکثر کی حالت انتہائی نازک ہوتی ہے۔ اتنی امنگیں اور امیدیں لیے میوکلینک جاتے ہیں، جیسے کسی مقدس مقامات کی زیارت کو جا رہے ہوں۔

لیکن میں آپ کو پھر یاد دلاتا ہوں کہ اگر آج سے باون برس پہلے وسطی مغرب میں ہولناک طوفان نہ آتا تو شاید دنیا نہ میو برادران کے ناموں سے اور نہ ہی روچسٹر سے آشنا ہوتی اور نہ ہی ذہنی امراض کے علاج کے لئے حیرت انگیز دوا دریافت ہوتی۔

جب امریکہ کے مقامی باشندوں یعنی ریڈ انڈین کے ساتھ لڑائیاں شروع ہوئیں تو ڈاکٹر میو چھپا رہا۔ جب جنگ کا غبار چھٹ گیا تو وہ میدان جنگ میں پہنچا اور مردوں کو دفن کرنے لگا۔ اور زخمیوں کا علاج کرنے لگا۔ کم و بیش پچاس میل کے علاقے میں اس کے مریض پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر اتنے غریب تھے کہ وہ کسی ڈاکٹر کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر میو بعض اوقات ساری ساری رات کی مسافت طے کر کے ان کے پاس پہنچتا اور انہیں دوا دیتا۔ اکثر اوقات اسے شدید دھند اور برف باری میں بھی کئی کئی میل پیدل چلنا پڑتا۔

ڈاکٹر میو کے دو بیٹے تھے۔ ولیم اور چارلس۔ اب یہ دونوں دنیا میں میو برادران کے نام سے مشہور ہیں۔ آج ان میں سے بڑا بھائی ولیم میو " کینسر یا رسولی کے علاج کا سب سے بڑا ماہر مانا جاتا ہے۔ " بڑا بھائی، چھوٹے بھائی کو اور چھوٹا بھائی بڑے

بھائی کو اپنے سے زیادہ قابل سمجھتا ہے۔ اور دنیا کی نظروں میں سرجری یا علم جراحی میں دونوں یکتائے روزگار ہیں۔ وہ اتنی خود اعتمادی اور مستعدی سے کام کرتے ہیں کہ بڑے سے بڑے سرجن حیران رہ جاتے ہیں۔ صبح سات بجے ہسپتال پہنچنے کے بعد وہ برادرز مسلسل چار گھنٹے آپریشن کرتے ہیں۔ کئی برسوں سے ان کے روزانہ آپریشنوں کی اوسط پندرہ سے تمیں کے درمیان ہے۔ لیکن اس کے باوجود مطالعہ جاری رکھتے ہیں اپنے کام میں زیادہ سے زیادہ مہارت پیدا کرنے کے لئے سر گرداں رہتے ہیں۔ دونوں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انہیں ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اب روچسٹر کا پورا شہر میو کلینک کے دم سے آباد ہے۔ ہنگامے اور شور شرابے کی روک تھام کے لئے اب اس شہر میں ٹرامیں بھی نہیں چلتیں۔ حتیٰ کہ لوگ گلی کوچوں میں بھی اونچی آواز سے بات نہیں کرتے۔

ہسپتال میں کسی کے ساتھ کوئی ناجائز رعایت نہیں برتی جاتی۔ ویٹنگ روم میں غریبوں، کسانوں اور فلمی اداکاروں سبھی کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ان سب کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ امراء سے ان کی حیثیت کے مطابق فیس لی جاتی ہے۔ لیکن ایک ہسپتال سے کسی کو آج تک نہیں نکالا گیا کہ اس کے پاس فیس کے پیسے نہیں تھے۔

میو برادران اپنا ایک انتہائی وقت کسی حادثے کے بغیر غریبوں کے علاج معالجے میں صرف کرتے ہیں۔ بلوں کی ادائیگی نہ ہونے پر انہوں نے کبھی کسی کے خلاف مقدمہ دائر نہیں کیا۔ اور کبھی کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان کا خرچہ ادا کرنے کے لئے اپنا مکان گروی رکھے۔ موقع پر نقدی کی صورت میں ایک آدمی جو کچھ بھی دے

سکے وہ چپکے سے قبول کر لیتے ہیں، بات یہیں ختم ہو جاتی ہے اور بقایاجات کی کوئی مد نہیں کھولی جاتی۔ آپریشن کرنے سے پہلے وہ کسی مریض سے یہ سوال نہیں کرتے کہ اس کی مالی استعداد کیا ہے؟ فیس کی ادائیگی ہر شخص کی اپنی خوشنودی پر ہے۔

ایک شخص اتنا بیمار تھا کہ اسے اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ صحت یاب ہونے کے بعد اس نے ہسپتال کے اخراجات اپنے کھیت گروی رکھ دیے۔ جب میو برادران کو اس بات کا پتا چلا تو انھوں نے اس شخص کا بھیجا ہوا چیک واپس کر دیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے اپنی طرف سے بھی اسے ایک چیک بھیجا کہ وہ ان مالی نقصانات کی تلافی کر سکے۔ جو بیماری کے دوران اسے برداشت کرنا پڑے۔

یہ ایک چھوٹے سے قصبے کے دو ایسے نوجوانوں کی داستان حیات ہے۔ جنہیں دولت مند بننے کا قطعی کوئی لالچ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود دولت ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ انہوں نے کبھی شہرت کی پرواہ نہیں کی۔ اس کے باوجود امریکہ کے مشہور ترین سرجنوں میں سے ہیں۔

ان کی زندگی کی اصل مشن یہی ہے کہ دکھی انسانیت کی خدمت کی جائے۔ ہسپتال کے ویٹنگ روم میں ایک کتبہ آویزاں ہے۔ جس کی عبارت ان کی کامیابی کے راز کی عکاسی کرتی ہے۔ کتبے پر لکھا ہے "کوئی ایسی خوبی پیدا کیجیے"۔ جو لوگوں کی بھلائی کے کام آ سکے۔ اس طرح آپ چاہے لق و دق صحرا میں ہی کیوں نہ مسکن بنا لیں۔ لوگ خود بخود آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔

☆☆☆

ایونجلین بوتھ

امریکہ کا نام ورڈا کو اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر رونے لگا۔

میں نے اپنی زندگی میں جو سب سے زیادہ عجیب و غریب عورت دیکھی ہے۔ اسے کوئی ایک ہزار سے زیادہ مردوں نے شادی کے پیغامات دیئے تھے۔ ان میں امیر، غریب، معروف، غیر معروف سبھی قسم کے مرد شامل تھے۔ لیکن اس نے کسی کی پیش کش قبول نہ کی۔ یورپ کے ایک نامور شاہی خاندان کا ایک شاہزادہ مہینوں اس کے پیچھے مارا مارا پھرتا رہا۔ لیکن اس نے اس شہزادے کا دست سوال بھی جھٹک دیا۔ اور شادی کرنے پر رضامند نہ ہوئی۔ اور سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ چالیس برس کی عمر میں بھی اسے شادی کی درخواستوں والے اتنے خطوط آتے تھے کہ اس کے سیکرٹری نے کبھی اسے یہ خطوط دکھانے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔

اس کا نام ایونجلین بوتھ تھا۔ وہ ایک شاندار فوج کی سربراہ تھی۔ وہ فوج جس نے بڑے بڑے دشمنوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ یعنی نکتی فوج۔۔۔ اس فوج کے کوئی تیس ہزار افسر دور دراز کے چھیاسی ملکوں میں بھوکوں کو کھانا کھلاتے۔ اور اسی (80) مختلف زبانوں میں محبت کا پرچار کرتے تھے۔

جب ایونجلین بوتھ سے میں ملا تو مجھے بہت حیرت ہوئی۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ اتنی عمر رسیدہ ہے کہ دادی اماں کہلا سکتی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس عمر میں بھی

اس کے خوب صورت سرخ بالوں میں کوئی کوئی سفید بال تھا۔ اس کا چہرہ جوش وخروش سے تمتا رہا تھا۔ اور وہ بہت چست وچوبند دکھائی دے رہی تھی۔ آپ پوچھیں گے چالیس برس کی عمر میں چہرے کی تروتازگی اور بدن کی پھرتی، بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ اگر آپ نے کبھی اس عورت کو وحشی گھوڑے پر سواری کرتے ہوئے دیکھا ہوتا، جو دو آدمیوں کے قابو میں نہیں آتا تھا تو آپ سچ مچ یہ یقین کر لیتے کہ چالیس برس تو کیا زندگی کا آغاز ہی ستر برس کی عمر سے ہوتا ہے۔ اس گھوڑے کا نام ''سنہری قلب تھا۔'' اور جب وہ ''سنہری قلب پر سوار ہو کر چلائی، چلو، ''سنہری قلب زور سے اچھلا اور ادھر ادھر بدکنے لگا۔ آخر کار اس کی جرات مندی نے گھوڑے کو زیر کر لیا۔ اس کے بعد وہ روزانہ ایک گھنٹے تک گھڑ سواری کرتی۔۔۔ اور بعض اوقات تو وہ ایک ہاتھ میں گھوڑے کی لگامیں پکڑ کر دوسرے ہاتھ میں مسودہ پکڑ کر تقریر کی تیاری کرتی اور ساتھ ساتھ گھڑ سواری سے بھی لطف اندوز ہوتی۔

رات کو کاغذ کا ایک دستہ ہمیشہ اس کی چارپائی کے پاس پڑی ہوئی میز پر ہوتا۔ عام طور پر وہ آدھی رات کو بیدار ہوتی اور نوٹس تیار کرتی۔ ایک رات جب وہ نیند سے بیدار ہوئی۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ ایک گیت کے بول اور دھن تیار کرنے لگی۔ اس نے اپنے گھر میں تین سیکرٹری ملازم رکھے ہوئے تھے۔ اور بعض اوقات وہ ان میں سے کسی ایک کو رات کے دو بجے جگا لیتی اور باقاعدہ کام شروع کر دیتی۔

گھر سے دفتر تک موٹر میں جاتے ہوئے اسے پورا ایک گھنٹہ لگتا، سارا راستہ وہ سیکرٹری کو چٹھیاں لکھاتی جاتی۔

ایونجلین بوتھ نے مجھے بتایا کہ اس کی زندگی کا سب سے دل ہلا دینے والا واقعہ اس وقت پیش آیا۔ جب لوگ سونے کی تلاش میں یوکون بھاگے جا رہے تھے۔ شاید آپ کو یاد ہو گا کہ جب الاسکا میں سونا دریافت ہوا تھا، تو پوری امریکن قوم کے جذبات قابو سے باہر تھے۔ لوگوں کے جتھے کے جتھے سونے کی تلاش میں شمال کی طرف جانے لگے۔ اور اس موقع پر ایونجلین بوتھ نے فوراً محسوس کیا کہ اب اس جگہ مکتی فوج کی ضرورت پیش آئے گی۔ چنانچہ وہ دو تین تربیت یافتہ نرسوں اور دو چار اسٹنٹوں کے ہمراہ وہ یوکون روانہ ہو گئی۔ سکاگ وے پہنچنے پر اس نے دیکھا کہ مہنگائی اتنے عروج پر تھی کہ انڈے کی قیمت ایک شلنگ تھی۔ اور مکھن بارہ شلنگ چھ پنس فی پونڈ کے حساب سے فروخت ہو رہا تھا۔ بعض لوگ پیٹ سے بھوکے تھے۔ لیکن ان کے پاس بندوقیں ضرور تھیں۔ اور ہر جگہ اس نے لوگوں کو ''سوپی سمتھ'' کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے سنا تھا۔ ''سوپی'' جو کلونڈ کی قاتل تھا۔ سوپی سمتھ اور اس کے لٹیرے ساتھی اس انتظار میں تھے کہ کب سونے کی کانوں سے لوگ باہر آئیں اور وہ انہیں قتل کر کے ان کی دولت ہڑپ کر لیں۔ امریکی حکومت نے اسے مارنے کے لئے ایک دستہ بھیجا۔ لیکن سوپی سمتھ نے اس دستے کے تمام ارکان کو ہلاک کر دیا۔

سکاگ وے ایک خطرناک جگہ تھی۔ جس روز ایونجلین بوتھ وہاں پہنچی ، صرف اسی روز وہاں پانچ قتل ہوئے تھے۔ اسی رات اس نے دریائے یوکون کے کنارے ایک جلسہ کیا، اور بیس ہزار آدمیوں کے سامنے اتنی موثر تقریر کی کہ وہ سب کے سب وہ مذہبی گیت گانے لگے جو انہوں نے کبھی اپنی ماؤں سے سنے تھے۔ ''یسوع مسیح

میرے روحانی محبوب میرا اللہ تمہارے قریب ہے۔ اور ہمارا گھر پیارا گھر ہے۔''

رات بہت خنک تھی، چنانچہ جب وہ گا رہی تھی۔ تو کسی شخص نے چپکے سے اسکے کندھوں پر کمبل ڈال دیا۔ یہ نذرانہ عقیدت تھا۔

لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم رات ایک بجے تک یہی گیت گاتا رہا۔ اس کے بعد ایونجلین بوتھ اور اس کے ساتھی تھک ہار کر سونے کے لئے قریبی جنگل میں چلے گئے۔ جنگل میں انہوں نے چائے بنانے کے لئے آگ سلگائی، اور تھوڑی دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ پانچ مسلح آدمی ان کی طرف آ رہے ہیں۔ جب وہ قریب پہنچے تو ان کے سردار نے سر سے ہیٹ اتار کر کہا، میرا نام سوپی سمتھ ہے۔ اور میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میں آپ کے گیتوں سے بہت محظوظ ہوا ہوں۔''

چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا ''جب آپ گا رہی تھیں تو میں نے ہی آپ کے لئے کمبل بھیجا تھا۔ آپ چاہیں تو اسے اپنے پاس رکھ لیں۔ ممکن ہے اب آپ کو کمبل ایک اچھا تحفہ نہ لگے۔ لیکن ایسی جگہ جہاں لوگ سردی سے دم توڑ رہے تھے۔ یہی حقیر تحفہ بہت بڑی نعمت ہے۔

ایونجلین بوتھ نے اس سے سوال کیا کہ کیا اسے سکاگ وے میں خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس نے جواب دیا نہیں، جب تک میں یہاں ہوں، کبھی ایسا نہیں ہوگا، میں تمہاری حفاظت کروں گا۔

اس رات اس نے پونے تین گھنٹے اس رہزن سے باتیں کیں۔ وہ کہنے لگی ''میں انہیں نئی زندگی دینے آئی ہوں۔'' اور تم ان کی جانیں لے رہے ہو۔ یہ اچھی بات

نہیں ہے۔ یہ جان لو جیت تمہاری نہیں ہوگی۔ جلد یا بدیر وہ تمہیں جان سے ماردیں گے۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں اس خطرناک ڈاکو کو اس کے بچپن کے واقعات یاد دلائے، اور اسے بتایا کہ وہ اپنی دادی کے ہمراہ مکتی فوج کے دستوں میں شرکت کیا کرتا تھا۔ اس نے خود بھی اعتراف کیا کہ اس کی دادی اماں نے بستر مرگ پر اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اسے آخری بار وہ گیت سنائے جو انہوں نے ان جلسوں میں سیکھے تھے۔

اور وہ گیت کیا تھے۔

میرا دل اب برف سے زیادہ شفاف ہے۔

کیونکہ یہاں یسوع مسیح میرے ساتھ رہتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ میں گنہ گار ہوں، لیکن رب العزت نے مجھے معاف کر دیا ہے۔

اور اب میرے سامنے صراط مستقیم ہے۔

مس بوتھ نے اس سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ مل کر دو زانو ہو کر خدا سے معافی مانگے۔ اور پھر مکتی فوج کی یہ لڑکی اور سوپی سمتھ نامی ڈاکو نے جس نے شمال میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ خداوند ایزدی کے حضور دو زانو ہو کر خدا سے دعائیں مانگنے لگے۔ اشک آلود آنکھوں کے ساتھ سوپی نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ لوگوں کی جانیں نہیں لے گا۔ اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دے گا۔ جواباً مس بوتھ نے اس بات کی ضمانت دی کہ وہ اسے حکومت سے کم سے کم سزا دلانے کے لئے اپنا پورا اثر ورسوخ استعمال کرے گی۔

چار بجے صبح وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

رات کے نو بجے اس نے اپنے ایک آدمی کے ہاتھ اسے عطیے کے طور پر خورد ونوش کا سامان بھیجا۔

دو روز بعد کسی نے سوپی سمتھ کو قتل کر دیا۔ سکاگ وے کے لوگوں نے اس شخص کے اعزاز میں ایک یادگار تعمیر کی ہے۔ جس نے سوپی سمتھ کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔

میں جن مسرور ترین لوگوں سے ملا ہوں، ایونجلین بوتھ ان میں سے ایک تھی۔ مسرور اس لئے کہ اس نے اپنی زندگی دوسروں کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ جس شخص سے ملے، خواہ وہ کسی کی خادمہ ہو یا ریلوے اسٹیشن کا قلی۔ اس کی زندگی میں تھوڑا سا نکھار پیدا کر جائے۔



چالاک لوگ

باسل زاروف

وہ شخص جو ہمارے کسی نہ کسی عزیز کی موت کا یقیناً ذمہ دار ہے۔

باسل زاروف ۔۔۔ یہ بے حد امیر اور پر اسرار شخص ان لوگوں میں سے ایک تھا۔ جنہیں ساری دنیا نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتی تھی ۔ آج سے کئی سال پہلے اس کے سر کے لئے بیس ہزار پونڈ انعام رکھا گیا تھا۔ اس کے متعلق بیسیوں کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ وہ بین الاقوامی شک وشبہات اور قومی نفرت کا حیرت انگیز مجسمہ تھا۔

باسل زاروف نے انتہائی غربت میں آنکھ کھولی اور بعد میں بہت بڑا رئیس بن گیا۔ اس نے یہ دولت مشین گنیں، چھوٹی توپیں اور دوسرا اسلحہ بارود بیچ کر کمائی تھی۔ اس کی ایک داستان حیات کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ "لاکھوں انسانوں کی قبریں اس کی یادگار ہیں۔" اور مرنے سے پہلے ان کی الم ناک چیخیں اس کا مرثیہ۔

اٹھائیس برس کی عمر میں باسل زاروف کو ایک کام مل گیا۔ وہ ہفتے میں ایک بار پانچ پونڈ کے معاوضے پر اسلحہ بارود بیچا کرتا تھا۔ کمیشن اس اجرت کے علاوہ تھی ۔ ان دنوں وہ یونان میں تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ اسلحہ بارود بیچنے کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ اس کی مانگ پیدا کی جائے ۔ چنانچہ اس نے یونانیوں کے دلوں میں خوف وہراس پیدا کیا۔ اور انہیں یہ باور کرا دیا کہ وہ ایسے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں کہ

جوان کے دلوں کے پیارے ہیں۔ اس لئے انہیں اپنے وطن کی حفاظت کے لئے اسلحہ خریدنا چاہیئے۔

یہ آج سے کوئی پچاس برس پہلے کا واقعہ ہے کہ پورے ملک میں خوف کی لہر دوڑ گئی، فوجی بینڈ بجنے لگے، پرچم لہرانے لگے۔ مقرروں نے لوگوں کے سامنے شعلہ افشاں تقریریں کیں۔ اور یونان نے اپنے کی تعداد میں اضافہ کرکے باسل زاروف سے اسلحہ خریدا۔ اور ایک آبدوز کشتی بھی۔ یہ سب سے پہلی آبدوز کشتی تھی۔۔۔

اس سودے سے دولت کمانے کے بعد زاروف ترکوں کے پاس گیا اور انہیں کہنے لگا کہ ذرا دیکھیے تو یونانیوں نے کیا اودھم مچا رکھی ہے۔ وہ تمہیں صفحہ ہستی سے مٹانے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ ترکوں نے دو آبدوزیں خرید لیں۔ دونوں ملکوں نے دھڑا دھڑ اسلحہ خریدنا شروع کر دیا۔ اور زاروف نے اسی کش مکش میں 60.000,000 پونڈ ہتھیا لیے۔

پورے پچاس برس تک زاروف دونوں قوموں کے شک وشبہات کو ہوا دے کر ان کا خون چوستا رہا۔ دونوں کے درمیان دشمنی کی خلیج وسیع کرتا رہا۔ اور لڑائی کے خطرے کو قریب لانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔ جب روس اور جاپان کے درمیان چپقلش شروع ہوئی تو اس نے دونوں ملکوں کے ہاتھوں اسلحہ فروخت کیا۔ سپین اور امریکہ کی جنگ میں اس نے وہ بارود بیچا، جس سے امریکی سپاہیوں کو موت کا نشانہ بنایا گیا۔

پہلی عالمی جنگ میں اس نے جرمنی، انگلستان، فرانس اور اٹلی کی فیکٹریوں میں

جنگی سامان ذخیرہ کر رکھا تھا۔ اس طرح اس نے اتنی دولت کمائی کہ جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

پچاس برس تک وہ بھیگی بلی بن کر یورپ کے جنگی دفتروں کا طواف کرتا رہا۔ اس کی تمام نقل و حرکت انتہائی رازدارانہ تھی۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے دو ایسے شخص ملازم رکھے تھے کہ ان کا حلیہ بالکل اس جیسا تھا۔ ان کے ذمے ایک ہی کام تھا کہ وہ لوگوں کو اپنی شکل دکھاتے رہیں۔ تاکہ جس وقت وہ کسی اور ملک میں اپنے رازدارانہ مشن پر ہو۔ اخبارات میں یہ غلط خبریں چھپ سکیں کہ اس وقت وہ برلن یا فانٹی کارلو میں ہے۔ اس نے کبھی اپنی خوشی سے تصویر نہ کھنچوائی۔ اس نے کبھی خوشی سے انٹرویو نہ دیا۔ کبھی کسی کی دفاع یا تائید میں کچھ نہیں کہا۔ کبھی کسی بات کی وضاحت نہیں کی۔ اور کبھی کسی ناگوار سوال کا جواب نہیں دیا۔

چھبیس سال کی عمر میں جب وہ دراز قد اور دلکش تھا تو ایک سترہ برس کی دوشیزہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔

اس لڑکی سے اس کی ملاقات ایتھنز سے پیرس جاتے ہوئے ریل گاڑی میں ہوئی۔ وہ چاہتا تھا کہ فوراً اس لڑکی سے شادی کر لے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ پہلے ہی شادی شدہ تھی۔ اور اس کا شوہر سپین کا ایک رئیس تھا، جو حواس باختہ ہونے کے علاوہ عمر میں اس کے باپ کے برابر تھا۔ لڑکی کے مذہبی اعتقادات کے مطابق طلاق ممکن نہ تھی۔ چنانچہ زاروف نے اس کا انتظار کیا اور پچاس سال تک جدائی کی آگ میں

جلتا رہا۔آخر 1923ء میں اس لڑکی کے خاوند کا انتقال ہوا اور 1924ء میں اس نے زاروف سے شادی کر لی ۔اس وقت وہ پینسٹھ سال کی تھی ۔اور زاروف کی عمر ستر برس کی تھی ۔دو سال بعد وہ مر گئی ۔وہ اڑتالیس برس اس کی محبوبہ رہی ،اور صرف اٹھارہ مہینے اس کی بیوی رہی۔

اپنی موت تک زاروف گرمیاں پیرس کے قریب ایک خوب صورت علاقے میں گزارتا تھا۔لیکن اسکی پیدائش ترکی کے ایک دور دراز گاؤں میں ایک خستہ حال جھونپڑی میں ہوئی تھی ۔جس میں نہ تو کوئی دروازہ تھا ۔اور نہ کھڑکی ۔بچپن میں وہ گندے فرش پر سوتا تھا۔اور چیتھڑے پہنتا تھا۔

جب وہ پہلی بار لندن آیا تو اس کا حلیہ دیکھ کر لوگ سمجھتے تھے کہ وہ کوئی چور ہے۔ لیکن تیس برس بعد اسی شہر میں اسے شاہ انگلستان کی طرف سے نائٹ کا خطاب ملا تھا۔

1909ء کی ایک شام کو یہ پر اسرار شخص پیرس کے مشہور چڑیا گھر میں بند رہو گئے تھے ۔اور یہاں کا مشہور شیر شدید بیمار تھا۔ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پورا چڑیا گھر تباہ ہو جائے گا۔

چنانچہ زاروف نے منیجر کو بلایا اور خوب ڈانٹ ڈپٹ کی ۔منیجر کو یہ علم نہ تھا کہ وہ دنیا کے امیر ترین لوگوں میں سے کسی ایک سے مخاطب ہے ۔چنانچہ اس نے کسی قدر طنز سے جواب دیا کہ اس کے پاس جانوروں کی دیکھ بھال کے لئے پانچ لاکھ فرنیک بھی نہیں ۔اس پر زاروف نے کہا یہ لو۔۔۔اگر تمہیں یہی سب کچھ چاہیے تو یہ لو،،،، اور جس شخص کی گولیاں لاکھوں انسانوں کے سینوں کو چھلنی کر چکی تھیں ۔اس نے

جانوروں کی دیکھ بھال کے لئے 20,000 پونڈ کا چیک لکھ دیا۔ مینجر جو دستخط نہ پہچان سکا تھا۔ یہ سمجھا کہ اجنبی اسے بیوقوف بنا رہا ہے۔ اس نے یہ چیک عام کاغذوں میں پھینک دیا۔ اور اس واقعہ کو بھول گیا۔ کئی مہینوں بعد جب اس نے یہ چیک اپنے ایک دوست کو دکھایا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ چیک اصلی تھا۔ اور اس پر ایسے شخص کے دستخط تھے، جس سے زیادہ فرانس میں کوئی امیر نہیں تھا۔

زاروف کا انتقال پچاس برس کی عمر میں ہوا۔ اس وقت وہ تن تنہا، معذور اور بیماری سے لاچار ہو چکا تھا۔ ایک ملازم اسے پہیوں والی گاڑی پر بٹھا کر ادھر ادھر لے جاتا تھا۔ اور اب اسے صرف اپنے گلاب کے پھولوں کے باغ سے دلچسپی باقی رہ گئی تھی۔ اس نے پورے پچاس سال باقاعدگی سے ڈائری لکھی تھی۔ یہ 53 جلدوں پر مشتمل تھی۔ اور کہتے ہیں کہ اس نے موت سے پہلے یہ سارا ریکارڈ تلف کرا دیا تھا۔



مذہبی لوگ

بلی سنڈے

وعظ کرنے کے دوران ہی وہ اکثر اپنے ہاتھ توڑ لیتا۔

عیسائیت کا سب سے مشہور مبلغ، بلی سنڈے تبلیغ کا کام شروع کرنے سے پہلے ڈٹ کر شراب پیا کرتا تھا۔ وہ بیس بال کا مشہور کھلاڑی تھا۔

بعد میں جب وہ مبلغ بنا تو اس کی ہر دل عزیزی کا یہ عالم تھا کہ آٹھ کروڑ انسان۔ یعنی امریکہ کے مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک تہائی حصہ گناہ اور نجات کے متعلق اس کی روح گداز تقریریں سننے کے لئے جمع ہوتا تھا۔

وہ اکثر بتایا کرتا تھا کہ تیس سال کی تبلیغ کے دوران اس نے دس لاکھ سے زیادہ آدمیوں کو گناہ کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر سیدھا راستہ دکھایا تھا۔

مجھے بلی سنڈے سے کئی بار ملنے کا موقع ملا۔ وہ ایک طوفان تھا، یا یوں سمجھ لیجیے کہ کسی نے برقی قوت کو ایک انسانی ڈھانچے کی شکل دے دی تھی۔ میں نے اسے اس حالت میں بھی دیکھا تھا کہ اس نے اپنی چھاتی کو تھپ تھپایا۔ اپنے کوٹ، کالر اور ٹائی کو پھاڑا، جست لگا کر کرسی پر چڑھا، چبوترے پر ایک پاؤں ٹیک کر کھڑا ہوا اور پھر اپنے آپ کو فرش پر گرا کر بیس بال کے کھلاڑی کی طرح قلابازیاں کھانے لگا۔ بلی سنڈے کا وعظ سنتے ہوئے کبھی کسی شخص کو نیند نہ آئی تھی۔ اس کا وعظ سرکس کے تماشے کی طرح دلچسپ اور متنوع ہوتا تھا۔

وہ اتنے زور کے ساتھ تبلیغ کرتا کہ اسے جسمانی تربیت کے ایک ماہر کو بھی ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو کہ جب وعظ کرتے ہوئے اس کا کوئی جوڑ نہ اترا ہو۔ یا اس کے جسم کے کسی حصے میں موچ نہ آ گئی ہو۔

اس نے پٹس برگ میں آٹھ ہفتے وعظ کیا۔ اور تمام مقامی اخباروں نے اس کے جلسوں کی روداد جلی عنوانات کے ساتھ شائع کی۔ سرکاری محکموں کی طرف سے ملازمین کو ان جلسوں میں شرکت کرنے کی خاص چھٹی دی گئی۔ فیکٹریوں میں کام کرنے والی لڑکیاں دوپہر کے جلسوں میں جوق در جوق شریک ہوتیں۔ ایک روز پولیس کے دس افسر حاضرین میں سے نکل کر آگے بڑھے اور انھوں نے پندرہ ہزار سامعین کے سامنے عہد کیا کہ وہ آئندہ زندگی خداوند ایزدی کی اطاعت میں گزاریں گے۔

وہ ایوا کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس نے ایک یتیم خانے میں پرورش پائی۔ پندرہ برس کی عمر میں اسے مدرسے میں ایک معمولی ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت میں اسے پانچ پونڈ ماہوار تنخواہ کے علاوہ تعلیم جاری رکھنے کی بھی سہولت تھی۔ اس کے ذمے صرف اتنا کام تھا کہ رات کو دو بجے بستر سے اٹھے۔ پندرہ انگیٹھیوں کے لئے کوئلے لے جائے۔ ان میں سے چودہ کو تمام دن گرم رکھے۔ جھاڑو دے اور صفائی کرے۔ اور اس کے ساتھ کسی قسم کی کوتاہی کا مظاہرہ نہ کرے۔

اسے پہلی بہتر ملازمت اس وقت ملی جو وہ مارشل ٹاؤن آیوا میں ایک بیوپاری کا نائب ہوا۔ اسی ملازمت کے دوران میں اس نے بیس بال کے کھلاڑی کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔

وہ بیس بال کو اتنی تیزی سے بھگا سکتا تھا کہ شکاگو وائٹ سوکس کے کپتان پوپ ان سن تک نے اس کی خدمات حاصل کیں۔ اکیس برس کی عمر میں بلی سنڈے بڑے بڑے مقابلوں میں کامیابی سے حصہ لے کر بیس بال کے کھلاڑی کی حیثیت سے اپنے لئے ایک علیحدہ مقام پیدا کر چکا تھا۔

وہ بتایا کرتا تھا کہ میں صرف چودہ سیکنڈ میں بال کو چکر دے سکتا ہوں۔ ''تیز رفتاری کا یہ ریکارڈ آج تک نہیں توڑا جا سکا۔

بیوپاری کی دکان سے ملازمت چھوڑنے کے پانچ سال بعد انقلاب رونما ہوا۔ جس نے اسے ایک کھلاڑی اور شرابی سے ایک مشہور مبلغ بنایا۔ اتنا بڑا مبلغ کہ جان وسلے کے بعد کبھی کسی اور واعظ نے اتنا بلند مقام حاصل نہیں کیا۔

اس واقعہ کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔ یہ تفصیل خود بلی سنڈے کے اپنے الفاظ میں ہے۔

''یہ 1887ء کا واقعہ ہے۔ میں بیس بال کے چند کھلاڑیوں کے ہمراہ شکاگو کی ایک گلی میں پھر رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے ہم ایک حمام میں جا نکلے۔ یہ اتوار کی دوپہر تھی۔ ہم نے غسل کیا۔ اور ایک کونے میں براجمان ہو گئے۔ ہمارے سامنے گلی کے دوسرے کونے پر کچھ مرد اور عورتیں بانسریوں اور باجوں کی دھن پر وہ مذہبی گیت الاپ رہے تھے۔ جو میں بچپن میں اپنی ماں سے سنتا رہا تھا۔ گیت سن کر میں سسک سسک کر رونے لگا۔ پھر ان میں سے ایک شخص ہمارے پاس آیا، اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ہم پیسفک گارڈن مشن پر جا رہے ہیں۔ کیا آپ ہمارے ساتھ مشن پر

نہیں چلیں گے۔ آپ سچ مچ بہت محظوظ ہوں گے۔ ہمارے ساتھ تو ذرا چل کر دیکھیے، شرابی آپ کو بتائیں گے کہ انہوں نے کس طرح اپنی اصلاح کی۔ اور لڑکیاں بتائیں گی کہ انہوں نے کیوں کر اپنے آپ کو عصمت فروشی سے بچایا۔

''میں اپنی جگہ سے اٹھا اور میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا، میں نے راستہ پالیا ہے۔ اور میں یسوع مسیح کے پاس جا رہا ہوں۔ اب ہمارے راستے جدا جدا ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے منہ موڑ لیا۔ ان میں سے بعض نے قہقہے لگا کر میرا مذاق اڑایا۔ اور باقی مجھ پر آوازیں کسنے لگے۔ صرف ایک نیک بخت نے میری ڈھارس بندھائی۔

پڑھ لیا آپ نے؟ بلی سنڈے نے اپنے انقلاب کی داستان ان الفاظ میں بیان کی ہے۔ نکتہ چین اور شکی لوگ بلی سنڈے پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ محض زر کے لئے لوگوں کے اعتقادات کو بروئے کار لا رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اس نے وائی، ایم، سی، اے میں صرف سولہ سترہ پونڈ ماہوار معاوضے پر مذہب کی خدمت کرنے کے لئے بیس بال کے کھلاڑی کی حیثیت سے سو پاؤنڈ ماہوار کی آسامی چھوڑ دی۔ اور وائی، ایم، سی، اے کی یہ تنخواہ بھی وہ اکثر اوقات چھ چھ ماہ بعد لیا کرتا تھا۔

مجھے اچھی طرح وہ وقت یاد ہے۔ جب 1917ء میں بلی سنڈے نیویارک آیا۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد اس شہر میں جو ''بدمن کا بابل'' کہلاتا ہے۔ کبھی اس قدر مذہبی جوش وخروش دیکھنے میں نہ آیا۔ کئی مہینوں سے اس کی آمد کا انتظار ہو رہا تھا۔ تیاریوں کو آخری شکل دینے کے لئے کم از کم 20,000 جلسے ہوئے تھے۔ 166 سٹریٹ اور براڈوے میں چار سو مزدور 20,000 آدمیوں کے بیٹھنے کے لئے

سیٹیں بنانے میں دن رات کام کر رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر صرف پادریوں کے لئے دو ہزار نشستوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور دو ہزار رضا کار سات سات سو کی جماعتوں میں لوگوں کو بٹھانے اور راستہ دکھانے کے کام پر مامور تھے۔

نیویارک میں اپنے قیام کے دوران بلی سنڈے نے کم وبیش ساڑھے بارہ لاکھ لوگوں کے سامنے واعظ کئے۔ ان میں تقریباً 100,000 لوگوں نے اس کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے کے بعد صراط مستقیم پر چلنے کا وعدہ کیا۔

☆☆☆

حیرت ناک لوگ

ہیلن کیلر

اندھی، بہری اور گونگی لڑکی جسے نپولین جیسی شخصیت قرار دیا جاتا ہے

مارک ٹیون نے ایک بار کہا تھا "انیسویں صدی کی دو سب سے دل چسپ شخصیات نپولین اور ہیلن کیلر ہیں۔" مارک ٹیون نے یہ بات اس وقت کہی تھی، جب ہیلن کیلر کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی۔ آج بھی وہ بیسویں صدی کی عظیم ترین شخصیات میں سے ایک ہیں۔

ہیلن کیلر بالکل نابینا ہے۔ اس کے باوجود اس نے اتنی کتابیں پڑھی ہیں کہ جتنی بہت سی آنکھوں والے بھی نہیں پڑھ سکتے۔ ایک عام شخص جتنی کتابیں پڑھ سکتا ہے۔ اس نے اس سے سوگنا کتابیں تو ضرور پڑھی ہوں گی۔ پھر وہ سات کتابوں کی مصنف بھی ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے بارے میں ایک فلم بھی بنائی تھی۔ اور اس میں کام بھی خود ہی کیا تھا۔ وہ بالکل بہری ہے۔ لیکن ان لوگوں سے زیادہ موسیقی سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ جن کے کان اچھے بھلے ہوں۔

اپنی زندگی کے نو برس وہ قوت گویائی سے محروم رہی۔ اس کے باوجود اس نے یونین کی ہر ریاست میں تقریریں کی ہیں۔ وہ پورے یورپ کا چکر لگا چکی ہے۔

ہیلن کیلر پیدا ہوتے وقت بالکل نارمل تھی۔ اپنی زندگی کے پہلے ڈیڑھ برس میں وہ دوسرے بچوں کی طرح دیکھ اور سن سکتی تھی۔ اور اس نے تھوڑا تھوڑا بولنا بھی شروع

کر دیا تھا۔ پھر یکا یک وہ ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔ ایک بیماری نے اسے اس بری طرح پچھاڑا کہ انیس مہینے کی عمر میں اندھی، بہری اور گونگی بنا دیا۔ اور عمر بھر کا روگ لگا دیا۔

تندرست ہونے کے بعد وہ جنگلی جانوروں جیسی حرکتیں کرنے لگی، جو چیز اسے ناگوار گزرتی، اسے توڑ دیتی۔ دونوں ہاتھوں سے کھانا اپنے منہ میں ٹھونس لیتی۔ اور اگر کوئی اسے ٹوکتا تو وہ زمین پر لیٹ کر زور زور سے لاتیں مارتی اور چیخنے کی کوشش کرتی۔

انتہائی مایوسی کے عالم میں اس کے والدین نے اسے بوسٹن میں اندھوں کے انسٹی ٹیوٹ میں بھیج دیا۔ پھر اس کی تاریک زندگی میں این مینسفیلڈ سلی وان روشنی کی دیوی کی طرح داخل ہوئی۔ مس سلی وان بوسٹن میں پرکن انسٹی ٹیوٹ سے فارغ التحصیل ہونے کے وقت صرف بیس سال کی تھی۔ اس نے ایک ایسا کام شروع کیا جو بالکل ناممکن نظر آتا تھا۔ یعنی گونگے، بہرے اور اندھے بچے کو تعلیم دینے کا کام۔ اس کی اپنی زندگی انتہائی غربت کی وجہ سے بے حد الم ناک تھی۔

این سلی وان کو دس برس کی عمر میں چھوٹے بھائی کے ساتھ ٹیوکس بری میسی چیوسٹس کے یتیم خانے میں بھیج دیا گیا۔ اس جگہ لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ یہ دونوں بچے اس جگہ سوتے تھے "جو مردہ خانہ کہلاتا تھا۔" وہ کمرہ جہاں نعشوں کو دفن کرنے سے پہلے رکھا جاتا ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی اس قدر خوف زدہ ہوا کہ چھ مہینے بعد اس دنیا سے چلا بسا۔

خود این ابھی چودہ برس کی تھی کہ اس کی بینائی اس قدر خراب ہو گئی کہ اسے پرکن

انسی ٹیوٹ بھیجا گیا۔ تاکہ وہ انگلیوں کے لمس سے پڑھنا سیکھ سکے۔ لیکن وہ اندھی نہ ہوئی۔ کم از کم اس وقت نہیں۔ اس کی بینائی پہلے سے بہتر ہوگئی۔ اس واقعہ کے کوئی پچاس برس بعد اور اپنی موت سے کچھ روز پہلے وہ بینائی سے مکمل طور پر محروم ہوگئی۔

میں مختصر الفاظ میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ این سلی ون نے ہیلن کیلر پر کون سا جادو کیا اور کس طرح ایک ماہ کے مختصر عرصے میں وہ ایک ایسے بچے کے ساتھ تبادلہ خیال کرنے میں کامیاب ہوگئی کہ جو مکمل تاریکی اور خاموشی کی دنیا میں گم تھا۔ ہیلن کیلر کی اپنی کتاب میری داستان حیات میں " یہ واقعات تفصیل کے ساتھ قلم بند ہیں کوئی ایسا شخص جس نے یہ کتاب پڑھی ہو۔ اس خوشی کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ جو اس اندھے، بہرے اور گونگے بچے کو اس وقت ہوئی تھی جب اس پر یہ بھید کھلا تھا کہ انسانی تقدیر جیسی بھی کوئی چیز ہے۔ اس روز شاید دنیا میں کوئی بچہ مجھ سے زیادہ مسرور نہ تھا۔ وہ لکھتی ہے۔ جب وہ سنہری دن ڈھلے اپنے بستر پر لیٹی تو ان خوشیوں کا تصور کر رہی تھی، جو وہ دن میرے لئے لایا تھا۔ اور زندگی میں پہلی بار مجھے اگلے دن کا شدت سے انتظار تھا۔

بیس برس کی عمر میں ہیلن کیلر نے اتنا کچھ سیکھ لیا تھا۔ کہ اس نے ریڈ کلف کالج میں داخلہ لے لیا۔ اور اس کی استانی بھی اس کے ہمراہ وہاں گئی۔ اس وقت تک اس نے کالج کے کسی دوسرے طالب علم کی طرح نہ صرف لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ بلکہ اس کی قوت گویائی بھی بحال ہوگئی تھی۔ اس نے زندگی میں جو پہلا جملہ سیکھا تھا " میں اب گونگی نہیں ہوں۔ " اور اسے بار بار دہراتی تو اس حقیقت کے اظہار سے اس کا دل

مارے خوشی کے بلیوں اچھلنے لگتا کہ "میں ابھی گونگی نہیں ہوں۔"

آج اس کا لب ولہجہ اس شخص جیسا ہے۔ جو غیر ملکی زبان بول رہا ہو۔ وہ اپنی کتابیں اور مضمون ایک ٹائپ رائٹر سے لکھتی ہے۔ اور اگر وہ حاشیے پر کوئی غلطی لگانا چاہے تو بالوں کی سوئی سے کاغذ پر چھوٹے چھوٹے سوراخ کر دیتی ہے۔

وہ نیویارک شہر کے ایک علاقے فارسٹ ہلز میں رہتی ہے۔ میں اس کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر رہتا ہوں۔ اور جب میں سیر کے لئے گھر سے نکلتا ہوں تو بعض اوقات اسے اپنے کتے کے ساتھ گھر کے باغیچے میں چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ میں اکثر دیکھتا ہوں کہ وہ ٹہلتے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ لیکن وہ میری اور آپ کی طرح ہونٹوں کو جنبش نہیں دیتی۔ وہ انگلیوں کو حرکت دیتی ہے اور اپنے آپ سے اشاروں کی زبان میں باتیں کرتی ہے۔ اس کی سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ مس ہیلن کیلر میں سمت اور رخ کا اندازہ لگانے کی حس ہم میں سے کسی سے بہتر نہیں ہے۔ وہ اکثر اوقات اپنے گھر ہی میں راستہ بھول جاتی ہے۔ اور اگر میزیں کرسیاں ادھر سے ادھر ہو جائیں تو اسے سخت مشکل ہوتی ہے۔

اس کے باوجود اس میں لمس کی حس اتنی شدید ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے ہونٹوں پر آہستہ سے انگلی رکھ کر یہ جان سکتی ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح وہ پیانو اور وائلن کے دستے پر انگلیاں رکھکر موسیقی کے زیر و بم سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ مشین کے ارتعاش کو محسوس کر کے وائرلیس کا پیغام بھی سمجھ سکتی ہے۔ مغنی کے گلے پر انگلیاں رکھ کر وہ گانے سے محظوظ ہوتی ہے۔ لیکن بذات خود وہ گا

نہیں سکتی۔

اگر ہیلن کیلر آج آپ سے ہاتھ ملائے، اور پھر پانچ برس بعد آپ سے ملے اور مصافحہ کرے تو اس مصافحے سے وہ یہ جان سکتی ہے۔ کہ آپ غمگین ہیں، مسرور یا خوش یا پھر مایوس ہیں۔

وہ کشتی کھیلتی ہے۔ تیرتی ہے۔ اور اسے جنگل میں گھڑسواری سے محبت ہے۔ وہ ایک خاص سیٹ سے شطرنج کھیلتی ہے۔ اور برسات کے دنوں میں وہ سویٹر وغیرہ بھی بنتی ہے۔

ہم میں سے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اندھاپن سب سے بڑی لعنت ہے۔ لیکن ہیلن کیلر کا کہنا ہے کہ اسے اندھا ہونے کا اتنا رنج نہیں جتنا بہری ہونے کا قلق ہے۔ اس تاریکی اور خاموشی میں جو دنیا اور اس کے درمیان دیوار کی طرح حائل ہے۔ وہ جس چیز کے لئے سب سے زیادہ ترستی ہے۔ وہ انسانی آواز کا ہمدردانہ لب ولہجہ ہے۔

☆☆☆

مہم باز

کیپٹن رابرٹ فالکن سکاٹ

اس کی کہانی دنیا کی سب کہانیوں سے زیادہ بہادرانہ اور الم ناک ہے

میں نے قطب جنوبی پر پہنچنے والے دوسرے انسان، کیپٹن رابرٹ فالکن سکاٹ کی داستان حیات سے زیادہ بہادرانہ، روح گداز اور الم ناک کہانی آج تک نہیں سنی۔

یہ کہانی کہ سکاٹ اور اس کے دو ساتھی کس طرح برفانی تودے پر الم ناک موت کا شکار ہوئے، آج بھی بنی نوع انسان کے دلوں کو تڑپا دیتی ہے۔

سکاٹ کے موت کی خبر فروری 1913ء کی ایک دوپہر کو انگلستان پہنچی۔ اہل انگلستان یہ خبر سن کر دم بخود رہ گئے۔ٹرافالگار پر نیلسن کی موت کے بعد کسی خبر نے اتنا اثر نہیں کیا تھا۔

بیس برس بعد انگلستان نے آخری یادگار سکاٹ کے نام سے منسوب کر دی۔ یہ ایک پولر عجائب گھر تھا۔ دنیا میں اپنی قسم کا واحد پولر عجائب گھر، عمارت کے سامنے والے حصے پر رابرٹ سکاٹ کا یہ فقرہ کندہ ہے۔وہ قطب جنوبی کا راز جاننے گیا تھا ۔لیکن اس نے خدا کا بھید پا لیا۔

سکاٹ نے قطب جنوبی کے الم ناک سفر کا آغاز ''ٹیرا نووا'' میں کیا تھا۔ اور اس وقت سے جب اس بحری جہاز نے ''سرکل'' کے برفانی پانی میں چلنا شروع کیا تھا۔

وہ پریشان تھا اور اس کی قسمت کا ستارہ گردش میں تھا۔

بحری جہاز طوفانی لہروں کی زد میں آ گیا۔ عرشے پر پڑا ہوا سارا سامان سمندر میں گر گیا۔ بائلر کی آگ پانی سے سرد ہو گئی۔ اور کئی روز تک یہ عظیم الشان جہاز انتہائی کس مپرسی کی حالت میں غضب ناک سمندر کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرتا رہا۔

لیکن ابھی سکاٹ کی بد قسمتی کا آغاز ہی ہوا تھا۔

وہ اپنے ساتھ مضبوط خچر بھی لایا تھا۔ جنہیں سائبیریا کے برفانی علاقے میں چلنے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ لیکن یہ خچریں مصیبتوں کا شکار ہو گئیں۔ وہ روئی کے گالوں کی طرح اڑتی ہوئی برف میں ٹھوکریں کھاتی رہیں۔ یہاں تک کہ کھائیوں میں گر کر ان کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور مجبوراً انہیں گولی کا نشانہ بنانا پڑا۔

نیکسن کے شکاری کتوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ وہ حواس باختہ ہو گئے اور برفانی تودوں سے ٹکریں مارنے لگے۔

اس کے بعد سکاٹ اور اس کے چار ساتھیوں نے قطب جنوبی کی طرف آخری سفر کا آغاز کیا۔ وہ ایک ایسے تودے پر چڑھنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جس کا وزن 1000 پونڈ تھا۔ روز بروز وہ کھردری برف پر آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک زبردستی اپنے آپ کو آگے کھینچ رہا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ اور سطح سمندر سے نو ہزار فٹ کی بلندی پر کثیف ہوا میں بے دم ہوئے جا رہے تھے۔ اس کے باوجود وہ پریشان نہیں ہوئے تھے۔ خوف ناک سفر کے اختتام پر جو آج تک کسی شخص نے نہیں کیا تھا۔ کامیابی ان کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ وہ پر اسرار

قطب ان کا منتظر تھا۔ جس پر روزِ ازل سے آج تک کسی نے قدم نہیں رکھا تھا۔ جہاں کوئی جان دار نہیں رہتا تھا۔

چوتھے روز وہ قطب جنوبی پہنچ گئے۔۔۔۔لیکن۔۔۔وہاں صرف مصائب نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ان کے روبرو ایک چھڑی کے سرے پر کپڑے کا پھٹا پرانا ٹکڑا خوف ناک آندھی میں فتح کا نشان بن کر لہرا رہا تھا۔ ایک پرچم ناروے کے امنڈسن کا پرچم ان کے سامنے لہرا رہا تھا۔ اس پرچم کو دیکھ کر انہیں یہ احساس ہوا کہ کئی برسوں کی تیاری اور منصوبہ بندی اور کئی مہینوں کی مصیبتوں کے بعد وہ جس منزل مقصود تک پہنچے ہیں صرف پانچ ہفتے پیشتر ایک دوسرا شخص وہاں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ چکا ہے۔

مایوسی کے بوجھ تلے دب کر وہ اپنے وطن واپس روانہ ہوئے۔

اس خطرناک اور خوف ناک علاقے سے مہذب دنیا کی طرف ان کی واپسی کی کہانی انتہائی الم ناک ہے۔ برفانی ہواؤں نے ان کے حلیے بگاڑ دیئے۔ اور ان کی داڑھیوں تک میں برف کہ تہیں جم گئیں۔ وہ ٹھوکریں کھا کر گرے اور ہر نئی ضرب انہیں موت کے قریب لاتی گئی۔ سب سے پہلے ان میں سب سے زیادہ طاقت ور شخص ایونز کا پاؤں پھسلا اور وہ برف کے تودے سے ٹکرا کر مر گیا۔

اس کے بعد کیپٹن اوٹس بیمار پڑ گیا۔ اس کے پیروں کو برف نے ناکارہ بنا دیا۔

اور اس سے جلد چلا نہ جاتا تھا۔ اور اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی راہ میں بھی رکاوٹ بن رہا ہے۔ چنانچہ ایک رات اوٹس نے ایثار کی ایک ایسی مثال پیش کی، جو دنیا میں بہت کم دیکھنے میں آئی۔ وہ اوروں کی زندگی

بچانے کے لئے موت سے ہم آغوش ہو گیا۔

اس نے کسی چیخ و پکار کے بغیر بڑے پرسکون لہجے میں ”میں باہر جا رہا ہوں“ اور وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ اس کی نعش تک کا پتا نہ چل سکا۔ لیکن آج اس جگہ جہاں سے غائب ہوا تھا۔ ایک یادگار کھڑی ہے، جس پر لکھا تھا۔ یہیں کہیں ایک بہادر شخص موت سے ہم آغوش ہوا۔

سکاٹ اور اس کے دو ساتھی ٹھوکریں کھاتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ اب وہ شکل و صورت سے انسان بھی نظر نہ آتے تھے۔ ان کے ناک، انگلیاں اور پاؤں برف سے اتنے نرم ہو گئے تھے کہ ہاتھ لگانے سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جسم سے الگ ہو جائیں گے۔ 19 فروری 1912ء کو انہوں نے آخری بار خیمہ نصب کیا۔ ان کے پاس صرف اتنا ایندھن تھا کہ جس سے چائے کی دو پیالیاں تیار ہو سکیں۔ کھانا بھی اتنا ہی تھا کہ جس سے وہ بمشکل دو روز زندہ رہ سکیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی جانیں بچ گئی ہیں۔ کیونکہ اس جگہ سے ایک سپلائی ڈپو صرف گیارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ ایک دلیرانہ پیش قدمی سے وہ وہاں پہنچ سکتے تھے۔

یکایک ایک ناگہانی المیہ نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اچانک اتنا شدید طوفان آیا کہ جس کی تندی نے برف کے مضبوط تودوں میں بھی شگاف ڈال دیئے۔ دنیا کا کوئی جاندار اس میں سلامت نہ رہ سکتا تھا۔ سکاٹ اور اس کے ساتھی گیارہ روز کے لئے اس خیمے میں مقید ہو گئے۔ ان کا راشن ختم ہو گیا تھا۔ انجام قریب آ گیا تھا۔ اور انہیں اس کا علم تھا۔

اب ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا۔۔۔ایک آسان راستہ۔۔۔ان کے پاس افیون کی کافی مقدار تھی، جو اس قسم کی ہنگامی حالات کے لئے اپنے ساتھ لائے تھے۔اس کی بڑی سی خوراک کھانے کے بعد وہ اپنے وجود کو خوش گوار خوابوں میں گم کر سکتے تھے۔ایسی نیند جس سے وہ کبھی بیدار نہ ہوں۔

لیکن انھوں نے افیون نہ کھائی، انہوں نے تہیہ کرلیا کہ انگلستان قدیم کی روائتی قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے موت کا بہادری سے مقابلہ کریں گے۔

اپنی زندگی کے آخری وقت میں سکاٹ نے سر جیمز بیری کو خط لکھا۔جس میں ان الم ناک لمحوں کی تفصیل لکھی۔ان کا راشن ختم ہو چکا تھا۔اور موت ان کے سر پر کھڑی تھی۔لیکن اس کے باوجود سکاٹ اپنے خط میں لکھتا ہے کہ ہم نے اپنے خیمے کو خوشی کے جن گیتوں سے آباد کر رکھا ہے۔اگر تم انہیں سن سکتے تو تمہیں یقیناً مسرت ہوگی۔''

پھر آٹھ ماہ بعد ایک روز جب سورج کی کرنیں برف پر پھیلی ہوئی تھیں، انہیں تلاش کرنے والی جماعت کو ان کی نعشیں دکھائی دیں۔

انہیں اس جگہ دفن کر دیا گیا۔جہاں انہوں نے جان دی تھی۔انہیں ایک قبر میں دفن کر دیا گیا۔اور اس مشترکہ قبر پر ٹینی سن کے یہ اشعار لکھ دیئے۔

جرات مند دلوں کو وقت کے چرکوں نے کمزور بنانے کی کوشش کی، لیکن ان کا یہ عزم ختم نہ ہو سکا کہ جستجو اور تلاش جاری رکھی جائے اور ہمت نہ ہاری جائے۔



The end---------------- اختتام